بچوں کا پسندیدہ رسالہ

ماہنامہ

ساتھی

کراچی

جنوری ۲۰۱۲ء

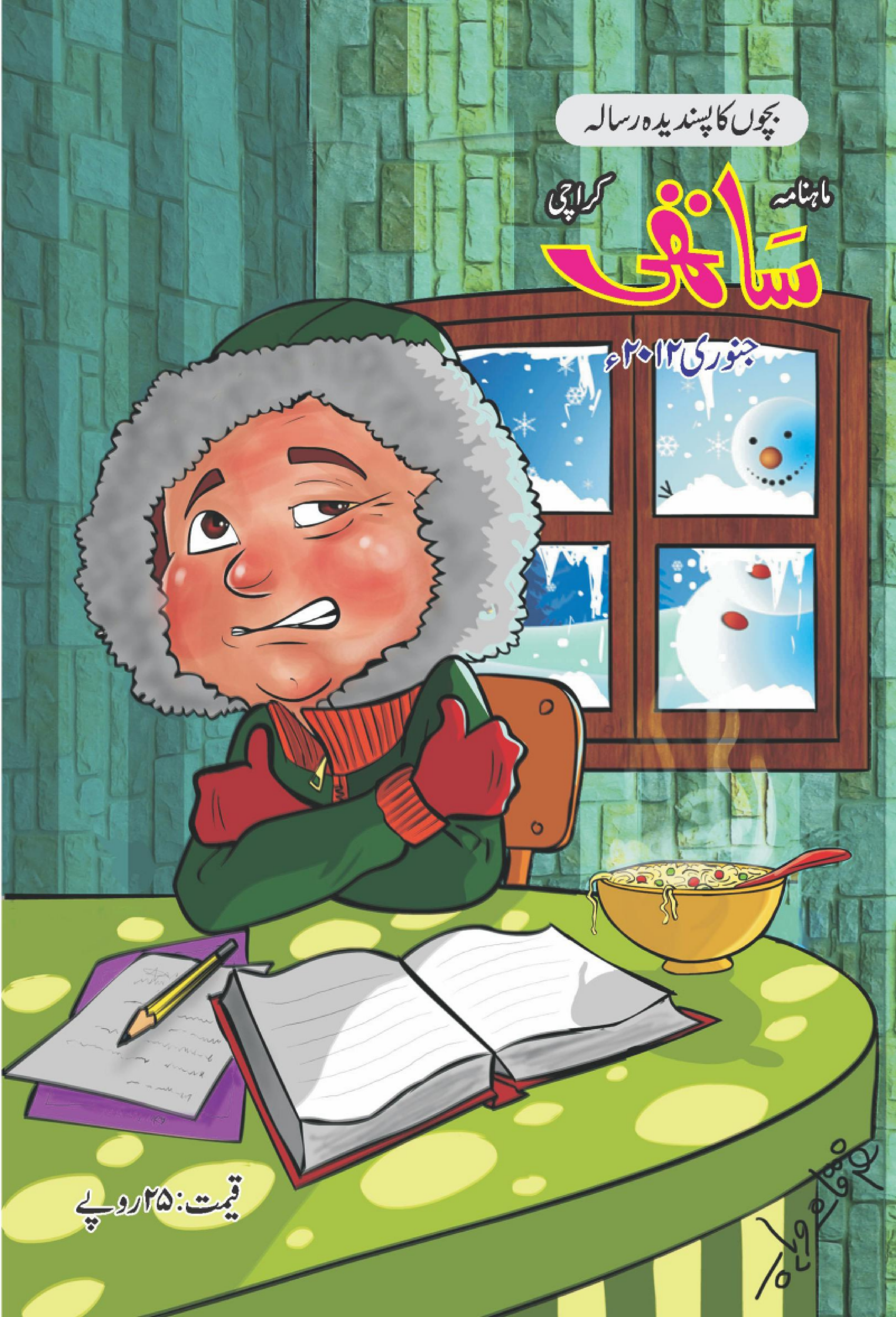

قیمت: ۲۵ روپے

نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان

ماہنامہ ساتھی کراچی

بیک وقت دو زبانوں میں شائع ہونے والا واحد ماہنامہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

جلد نمبر ۲۶ شمارہ نمبر ۱

جنوری ۲۰۱۲ء

قیمت -/۲۵ روپے

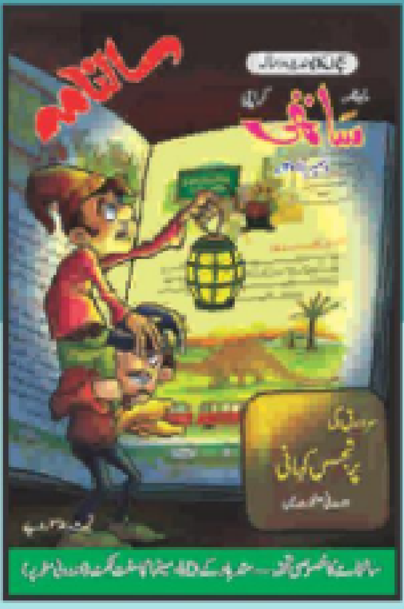

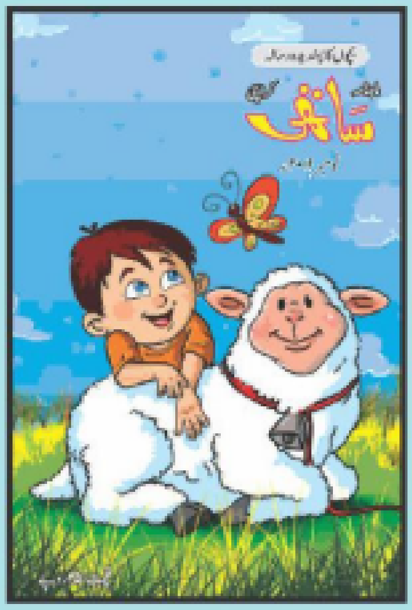

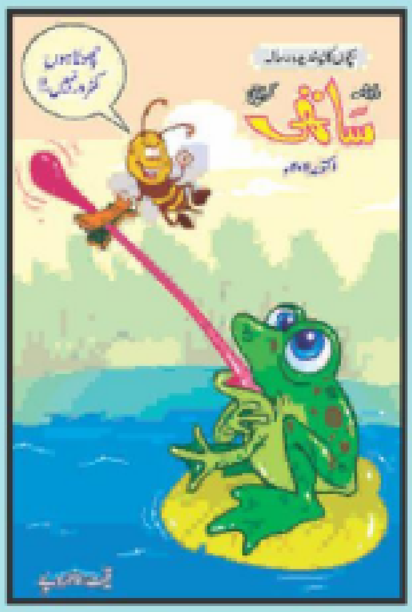

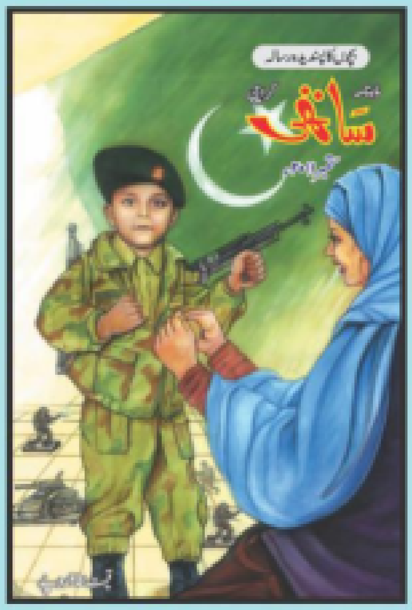

مدیر

شمعون قیصر

مجلس ادارت

فصیح اللہ حسینی

راحیل احمد خان

محمد عاصم صدیقی

سرکولیشن

سید عبدالرافع ہاشمی

0332-3745705

لعل بخش

0300-2325878

اشتہارات

عدیل اقبال شیخ

0334-3549960

سید عماد رضوی

0333-2079162

نیک بنو نیکی پھیلاؤ

بزمِ ساتھی

http://bazmesathi.org

رابطہ کیجیے

الف 206، سلیم ایونیو، بلاک B-13، گلشن اقبال، کراچی

پوسٹ بکس نمبر 17982

فون نمبر 34976468 فیکس: 34986418

monthlysathee@gmail.com

monthlysathee@hotmail.com

اوقاتِ کار: شام 5 تا رات 10 بجے

سالانہ خریداری

رجسٹرڈ ڈاک: 350/ روپے

شرق وسطیٰ: -/75 ریال

دیگر ممالک: -/35 ڈالر

ناشر: سرفراز احمد

اس ماہ کی سوغات

۸	روزی (آخری حصہ)	فوزیہ خلیل
۱۵	خاتون جنت	فریال یاور
۲۴	وہ شکریہ کہنا بھول گئی	گل رعنا
۲۸	حمد باری تعالیٰ	ضیاء الحسن ضیاؔ
۲۹	درمیانی راستہ	اعظم طارق کوہستانی
۳۵	زرافہ	میر بابر مشتاق
۴۴	پھول سی تتلی (نظم)	نعیم الدین نعیم
۴۵	بہروپیے	وقار محسن
۴۸	کوئی نہ کرنا کام ادھورا (نظم)	شاؔم درانی
۵۶	برے پھنسے	ڈاکٹر عمران مشتاق
۶۰	پند (نظم)	افق دہلوی
۶۱	موت کا راستہ	اشتیاق احمد
۶۸	صحرائی جہاز	محمد علی
۷۲	سب سے بڑا جھوٹ	ابرار محسن
۸۰	راجپوت کی بستی میں	ش کاظمی
۹۰	دوستی	قیصر زاہدی
۹۳	دفاع	سلطان محمود درانی
۹۶	ایک انار سو بیمار	سمعیہ غفار

مستقل سلسلے

۶	قرآن محفل	۲۳	ایک شہر ایک صفحہ	۵۰	اب تو بتادیجیے
۳۴	کوچہ اشعار	۳۸	مسکرایئے ناں	۹۸	کھٹے میٹھے خط
		۱۰۳	مختصر + دلچسپ		

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔“ (سورۃ الحجرات، آیت نمبر۱۲)

پیارے نبی نے فرمایا کہ معراج کی رات میں جہنم کے کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کو الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں دوسروں کے اندران کی موجودگی میں کیڑے نکالتے تھے اور یہ وہ لوگ ہیں جو پیٹھ پیچھے برائی بیان کرتے تھے۔ اسی طرح فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی کے پاس اس کا کھلا ہوا نامہ اعمال لایا جائے گا، وہ اس کو پڑھے گا پھر کہے گا کہ اے میرے رب، میں نے دنیا میں فلاں فلاں نیک کام کیے تھے وہ تو اس میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب دے گا کہ لوگوں کی غیبت کرنے کی وجہ سے وہ نیکیاں تمہارے نامہ اعمال سے مٹا دی گئی ہیں۔

ساتھیو! اسکول میں پڑھائی کے دوران دوستوں کے ساتھ کھیل کے دوران یا دیگر مصروفیات کے اندر ہم کتنی دفعہ اپنے دوستوں کی غیبت کر بیٹھتے ہیں، کسی کی ٹوہ میں لگ جاتے ہیں اور اکثر دوسروں کے بارے میں برے گمان کر بیٹھتے ہیں۔ پیارے اللہ تعالیٰ اور پیارے نبیؐ کے یہ ارشادات ہمیں متوجہ کر رہے ہیں کہ دن بھر میں کیے جانے والے کاموں کا جائزہ لیں کہ کیا ہم نے آج یہ سارے غلط کام تو نہیں کیے اور اپنے دامن میں نیکیوں کی نسبت زیادہ گناہ تو نہیں بھر لیے؟؟

ڈینر پنسل کے تعاون سے خصوصی تحفہ

سوال: سورۃ الحجرات میں درج پانچ اخلاقی برائیوں کے نام بتائیں جن سے بچنا چاہیے۔

السلام علیکم

نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے سال کی سوغات کیلنڈر، نئے سال کی ڈائریاں، منصوبہ بندی کے خاکے وغیرہ بھی ہمارے گھروں میں آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان تمام سوغات کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم سال نو کی ٹھیک طرح منصوبہ بندی کر لیں۔

ساتھیو! آج ہمارے پاکستان کو قائم ہوئے 64 سال گزر چکے ہیں، ہمارا ہر گزرتا وقت ہمیں ہمارے مستقبل کے لیے کوئی سبق، کوئی پیغام دے جاتا ہے۔ وہ خواہ ایک گھنٹہ ہو، ایک دن ہو، ایک ہفتہ ہو، ایک مہینہ ہو یا ایک سال!

آج 64 برس گزرنے کے بعد جب 2012ء کا سال شروع ہوا ہے تو وہیں ایک سوال بھی لیے ہوئے ہے کہ ہم نے اپنے ان گزرے ہوئے لمحات سے کیا سیکھا؟ اور کیا اب ہم نے ایسا کوئی منصوبہ عمل تیار کر لیا ہے جس پر عمل کر کے ہم پاکستان کو مضبوط، مستحکم اسلامی ریاست بنا سکیں تاکہ یہ صحیح معنوں میں پوری دنیا کی قیادت کر سکے۔

سوچیے ...... سیکھیے اور کچھ ''بڑا کام'' کر گزرنے کی ٹھان لیں۔

والسلام

آپ کا ساتھی

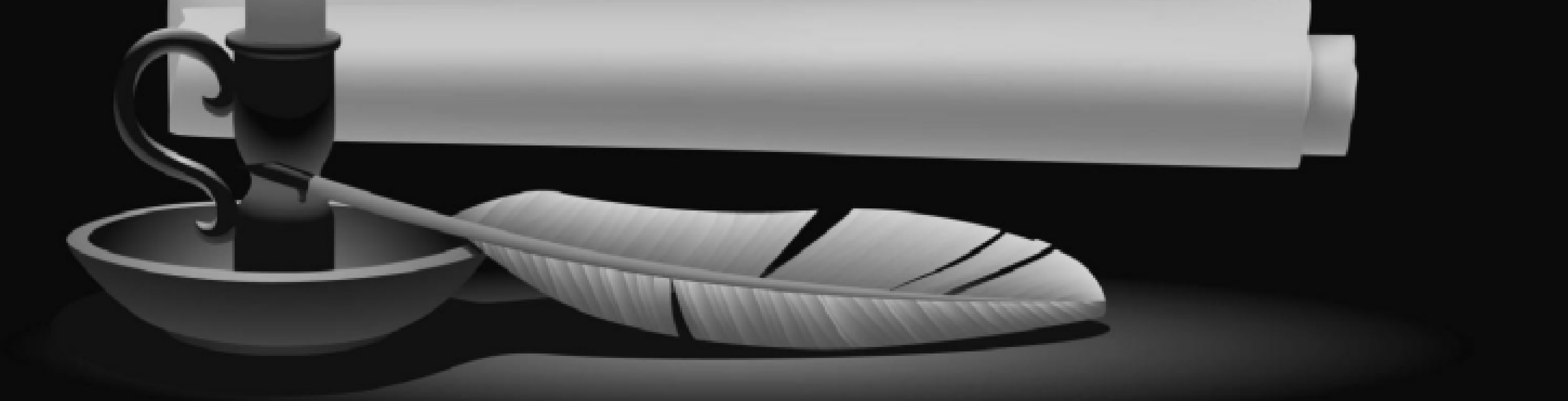

ہزار کے نوٹوں میں سے ایک پر لکھا تھا:

’’تم آجاؤ معاویہ۔‘‘

یہ ابوبکر کی اپنی لکھائی تھی۔ یہ لکھائی تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ نوٹ یہاں کہاں سے آیا۔ اسے یاد آیا کہ جب شفقت بھائی اس کے ابو سے پیسے لے کر آئے تھے۔ تو وہ اپنی کاپیوں پر معاویہ معاویہ لکھ رہا تھا۔ یقیناً اس نے بے خیالی میں کچھ نوٹوں پر بھی یہ تحریر لکھ دی تھی۔ مگر یہ نوٹ یہاں پر کہاں سے آیا۔ یہ نوٹ تو معاویہ کے والد کو دے دئے گئے تھے اور پھر یقیناً انہوں نے اغواء کرنے والوں کو جمع کرا دیئے ہوں گے۔ پھر یہ نوٹ ادھر کہاں سے آگیا۔ وہ سوچتا رہا سوچتا رہا مگر کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔ اچانک شفقت بھائی اندر داخل ہوئے۔ ابوبکر کو دیکھ کر وہ مسکرائے، انہیں آتا دیکھ کر ابوبکر نے وہ والا نوٹ خاموشی سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

’’تم ہوش میں آگئے ابوبکر۔‘‘ انہوں نے پیار سے

روزی

فوزیہ خلیل

آخری حصہ

چیخنے کی ضرورت نہیں...... جو طے ہو گیا سو ہو گیا......!!

اس کے گال تھپتھپائے۔ پھر بولے۔ ''یہ سارا سامان تمہارے والد نے بھیجا ہے۔ اور وہ خود بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔''

ابوبکر خاموش رہا، وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

''اوہ۔۔ میں نے یہاں تکیئے کے نیچے کچھ پیسے رکھ دیئے تھے، اسپتال میں بل وغیرہ دینے کی ضرورت پڑے گی۔ تمہاری چھٹی ہونے والی ہے۔'' وہ بولے اور تکیئے کے نیچے سے پیسے نکالنے لگے۔

''یہ پیسے آپ کے پاس کہاں سے آئے شفقت بھائی۔'' ابوبکر نے ان سے سوال کیا۔ وہ بہت غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''کیوں؟؟'' وہ بولے۔

''مجھے بتایئے آپ کو یہ پیسے کس نے دیئے؟''

''کون دیتا؟'' وہ مسکرائے۔

''ٹال مٹول مت کیجیے شفقت بھائی۔ کیا آپ کا تعلق کسی اغواء کرنے والے گروہ سے ہے۔ مجھے جواب دیجئے۔'' ابوبکر نے اچھل کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔

''کیوں ان نوٹوں میں ایسی کیا بات ہے؟ اور پھر میں کیوں کسی کو اغواء کرنے لگا؟'' وہ اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے بولے۔

''معاویہ کے والد سے تاوان آپ ہی نے وصول کیا ہے شفقت بھائی۔'' ابوبکر ہسٹریائی انداز میں چیخ رہا تھا۔ جلد ہی وہاں ڈاکٹرز جمع ہو گئے، ابوبکر دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆

سارے نوٹ فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور سب ان نوٹوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

''نہیں۔ ان میں سے کسی نوٹ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے کہ ابوبکر یہ اندازہ لگائے کے یہ تاوان کے طور پر ادا کیئے گئے ہیں۔'' باس سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''تو پھر آخر ابوبکر نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ شفقت بھائی کا تعلق کسی اغواء کرنے والے گینگ سے ہے؟'' بروہی نے کہا۔

''اور میرا تعلق اغواء کرنے والے گینگ سے بھی نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کی کسی سرگرمی میں شریک ہوتا ہی کب ہوں؟ میں کسی گینگ سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں البتہ اگر کبھی وصی نہیں ہوتا تو میں گاڑی چلا لیتا ہوں اور اسکی بھی نوبت کم ہی آتی ہے۔'' شفقت بھائی نے منہ بنا کر کہا۔

''لیکن شفقت بھائی ......اب آپ کو اس گینگ سے اپنا تعلق جوڑنا ہی ہوگا۔'' باس نے سرد آواز میں کہا۔

''وہ کیوں؟؟؟ جب کہ......'' شفقت بھائی کا جملہ باس نے کاٹ دیا۔

''بے شک شفقت بھائی تم اغواء گروپ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے لیکن اب جب کہ تم شک کی زد میں آرہے ہو، اور یہ معمہ بھی حل ہو ہی جائے گا کہ ابوبکر کو یہ شک کیسے ہوا۔ لیکن شک کی زد میں آنے کے بعد تم ہی اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دو گے۔ میری اس سلسلے میں بروہی سے بات ہو گئی ہے۔''

’’کیا مطلب۔۔۔؟‘‘ شفقت بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔’’میں صرف ایک ڈرائیور ہوں اور صرف اسی کی تنخواہ لیتا ہوں۔ میں مجرم کیوں بنوں؟ کیوں بروہی صاحب میری وفاداری کا یہ صلہ؟‘‘

’’ہماری مجبوری سمجھیں۔ ابھی تک ابوبکر آپ کو مجرم سمجھ رہا ہے۔ یہ معاملہ یوں حل ہو رہا ہے۔ مجھ تک بات نہیں پہنچ رہی ہے۔ اگر وہ مجھے مجرم کی حیثیت سے جان لے تو۔۔۔ اسکی زندگی تباہ ہو جائے گی۔۔۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔‘‘ بروہی نے کہا۔

’’اپنے بیٹے کی زندگی، خوشی اور غم کی کتنی پرواہ ہے تم کو کیا معاویہ کسی کا بیٹا نہیں، کیا وہ سب کسی کے بیٹے نہیں تھے جن کو تم لوگوں نے اغواء کیا۔‘‘ شفقت بھائی چیخ پڑے۔

’’چیخنے کی ضرورت نہیں۔ جو طے ہو گیا سو ہو گیا۔ اگر یہ معاملہ اٹھتا ہے کہ تاوان تم نے وصول کیا تھا تو تم حامی بھرلو گے۔ ورنہ جان لو باس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ہم تمہیں کسی جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیں گے۔ پھر ساری عمر جیل میں سڑنا۔‘‘

’’جیل میں تو اب بھی سڑنا ہے۔‘‘

’’نہیں۔۔۔ ہم تم کو ضمانت پر رہا کرا لیں گے زیادہ پریشانی نہیں رہے گی۔‘‘ شفقت بھائی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سب کو دیکھا اور باہر نکل گئے۔

☆......☆

’’بروہی......سن رہے ہو۔ تمہارے بیٹے نے پولیس کے سامنے ثابت کر دیا کہ شفقت بھائی مجرم ہیں اور اس نے اپنا جرم قبول کر لیا۔ اور پولیس شفقت بھائی پر ظلم توڑ رہی ہے۔ کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتائے۔‘‘ باس نے ایک قہقہہ لگایا۔

’’پھر اگر اس نے بتا دیئے تو پھر؟؟ کیا ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہو گا؟ اور پھر یہ کب کی بات ہے؟‘‘

روڈی نے فوراً پوچھا۔

’’یہ کل صبح کی بات ہے۔ شفقت بھائی ایک بزدل آدمی ہے وہ بھلا ہمارا ٹھکانہ بتا سکتا ہے پولیس کو؟‘‘ باس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

’’مگر باس ہم کو یہ امکان بھی مدنظر رکھنا ہو گا۔ پولیس کبھی بھی ہمارے ٹھکانے کو گھیر سکتی ہے۔‘‘ باس کے نائب جھاکا نے فوراً کہا۔

’’ہاں باس جھاکا درست کہہ رہا ہے۔‘‘ بروہی نے کہا۔

پانچ ہی منٹ بعد روڈی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔’’باس پولیس ہمارے ٹھکانے کو تیزی سے گھیرے میں لے رہی ہے۔‘‘

’’فکر کی کوئی بات نہیں۔ اپنا سامان سمیٹ لو اور جھاکا، تم معاویہ کو نیچے سرنگ والے کمرے میں چھپا دو۔ پولیس کی فکر نہ کرو اسے میں سنبھال لوں گا۔ اب جبکہ شفقت بھائی کو اپنی زندگی سے کوئی امید نہیں رہ گئی۔ تو انہوں نے ہمارا ٹھکانہ بتا دیا۔ خیر۔ شفقت بھائی سے تو ہم ایسے نمٹیں گے کہ ان کی آئندہ نسلیں

یاد رکھیں گی۔'' روڈی بولا۔
آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر ایاز کی آواز مائیک پر گونجنے لگی۔ ''اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔''
اعلان تین بار دہرایا گیا۔ سناٹے میں آواز پھیل گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر انسپکٹر ایاز کی آواز ابھری۔ ''تم لوگ اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دو۔ مجھے کود کر اندر جانا ہوگا۔ اندر بے گناہ بچے بھی ہوں گے۔''
ذرا ہی دیر میں انسپکٹر ایاز اندر داخل ہو رہا تھا۔ انسپکٹر ایاز پولیس میں کچھ خاص پرانا نہیں تھا۔ کافی عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد وہ پولیس کی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسکا تعلق ایک نہایت غریب گھرانے سے تھا۔ ابھی حال ہی میں وہ سب انسپکٹر سے انسپکٹر ہوا تھا۔ انسپکٹر ایاز اندر داخل ہوا تو باس چہرے پر نقاب لگائے تنہا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
''ہاتھ اٹھا دو۔ تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟'' انسپکٹر ایاز چلایا۔
''تم سب کیلئے میں اکیلا ہی کافی ہوں اور ہاتھ اٹھانے کا تکلف میں کبھی نہیں کرتا انسپکٹر۔ یہ بتاؤ انسپکٹر کہ تمہاری قیمت کیا ہے۔ کتنے میں بکنا پسند کرو گے۔''
انسپکٹر ایاز خاموش رہا۔
''چند ہزار کمانے والے ایک معمولی انسپکٹر تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ بولو انسپکٹر اپنی قیمت بتاؤ۔ معاملہ کتنے کروڑ میں طے ہو سکتا ہے۔ جتنی خاموشی سے آئے ہو اتنی خاموشی سے لوٹ جانا۔''
انسپکٹر ایاز سوچ میں پڑ گیا۔ ایک کروڑ تو کیا اس نے تو کبھی ایک لاکھ بھی نہ دیکھے ہونگے۔ پہلے اس نے سوچا انکار کر دے مگر پھر اسے اپنی مجبوریاں نظر آنے لگیں۔ بیمار والدین، بہنوں کی شادیاں، بھائیوں کی تعلیم۔
باس نے جھک کر اپنا بریف کیس کھولا اس میں گڈیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔
''یہ لو انسپکٹر۔ دو کروڑ تمہارے اور دس دس لاکھ تم اپنے ساتھیوں میں بانٹ دینا۔ اور فوراً یہاں سے لوٹ جاؤ آئندہ بھول کر بھی یہاں کا رخ مت کرنا۔ تمھیں اس بار یہاں سے زندہ بھیج رہے ہیں ورنہ آئندہ۔۔۔'' باس کی پھنکارتی ہوئی آواز انسپکٹر ایاز کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ جھک کر گڈیاں سمیٹنے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد پولیس واپسی کا رخ کر رہی تھی۔

☆......☆

اب اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ آپ کے ساتھی یہاں سے نکل کر اوپر جا چکے ہیں۔ تو کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں انکل؟'' معاویہ کہہ رہا تھا۔
''انکل؟؟؟'' بروہی کو اس کا لہجہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔
''پوچھو بیٹے پوچھ لو۔۔ یوں بھی ذرا دیر میں تمھیں چھوڑ دیا جائے گا۔'' بروہی نے غور سے اس معصوم سے لڑکے کو دیکھا۔ جو کے اس کے ہر دل عزیز اور

اکلوتے بیٹے کا عزیز از جان دوست تھا۔
"انکل آپ کی آواز ،آپ کے بولنے کا انداز، میرے دوست ابوبکر جیسا ہے۔اور پھر آپ کے ساتھی نے آپ کو بروہی کہہ کر پکارا۔گوکہ آپ کا چہرہ نقاب میں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میرے دوست ابوبکر بروہی کے والد ہیں۔"
بروہی لڑکھڑا گیا۔یہ انکشاف اس کے لئے حد درجہ تکلیف دہ تھا۔
"اگر تم ابوبکر سے واقعی حقیقی محبت کرتے ہو تو مجھ سے ایک وعدہ کرو معاویہ،تم یہ بات ابوبکر کو کبھی مت بتانا۔وہ ٹوٹ جائے گا،وہ بکھر جائے گا،وہ اپنے باپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔"
"بدلے میں آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ہم دونوں ہی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔
میں ہر وعدہ کرنے پر تیار ہوں۔" بروہی بولا۔
"انکل جرم کبھی نہیں چھپتا۔جرم کے لباس میں کہیں نہ کہیں چھید ہوتا ہے۔آج نہیں تو کل اس پر یہ ظاہر ہو جائے گا،انکل آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ یہ کام چھوڑ دیں گے۔"
بروہی سوچ میں پڑ گیا،چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔"تم نہیں جانتے معاویہ، گینگ سے الگ ہونا کتنا مشکل ہے۔اس کا انجام صرف موت ہے۔ باس مجھے ہر جگہ سے ڈھونڈ نکالے گا۔"
"آپ فوری طور پر یہ شہر چھوڑ دیں۔کسی دور دراز علاقے میں اپنی زندگی گزاریں۔اپنا نام اور حلیہ تبدیل کر کے کوئی حلال روزی کمائیں۔" معاویہ کہہ رہا تھا۔
چند لمحے بعد بروہی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
"معاویہ بیٹا۔۔۔۔۔ مجھے منظور ہے۔"

☆......☆

اور پھر کئی دن گزر گئے،معاویہ اپنے گھر آچکا تھا۔ابوبکر بھی صحت یاب ہو کر اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔بروہی بہت تذبذب کا شکار تھا۔وہ فیصلہ تو کر چکا تھا مگر عمل کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔وہ ہر وقت اپنی سوچوں میں گم رہتا۔اس رات جب بروہی اپنے بیڈروم میں تنہا لیٹا تھا،ابوبکر کمرے میں داخل ہوا۔
"میں کئی دن سے محسوس کر رہا ہوں آپ بہت پریشان ہیں ابو میں اب بڑا ہوں سمجھدار ہوں آپ مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کر سکتے ہیں۔آپ کہتے تھے نا ابو تم میرے بیٹے نہیں میرے دوست بھی ہو۔" وہ بولا۔
بروہی نے غور سے ابوبکر کو دیکھا۔
ابوبکر اس کی شادی کے ۱۰ سال بعد اس دنیا میں آیا تھا۔ابوبکر کا نام اس کی دادی نے رکھا تھا۔بروہی کو اپنی ماں کا وہ جملہ یاد آیا جو اس نے ننھے سے بچے کو گود میں لے کر کہا تھا۔
"میں اپنے پوتے کا نام بہت ہی عظیم ہستی پر رکھ رہی ہوں۔بیٹا تم دیکھنا میرا پوتا کس قدر اچھا اور نیک انسان بنے گا۔تم والدین اس پر فخر کرو گے۔" بروہی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے ہاتھ پکڑ کر ابوبکر کو

اپنے برابر میں بٹھالیا:

''ایک لڑکا تھا اس کی تعلیم کم تھی۔ بری صحبت کی وجہ سے وہ غلط ہاتھوں میں پڑ گیا۔اور یہاں تک کے وہ اغواء برائے تاوان کے گینگ میں شامل ہوگیا۔ پھر اس کا ضمیر زندہ ہوتا ہے وہ توبہ کرتا ہے مگر عمل کرنے میں ہچکچاتا ہے۔اسے کیا فیصلہ کرنا چاہیئے۔''

''یقیناً اللہ توبہ کرنے کو پسند کرتا ہے۔اسے ہچکچانا نہیں چاہیئے، بلکہ اپنے فیصلے پر ڈٹ جانا چاہیئے، ابو کیا آپ مجھے پوری تفصیل بتانا پسند کریں گے۔''ابوبکر نے غور سے اپنے والد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر بروہی نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ہر ہر بات آنسوؤں میں، ہچکیوں میں۔

''تمھیں یہ سب جان کر بہت دکھ ہوگا بیٹے مگر......''

بروہی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اب جبکہ آپ سب کچھ چھوڑ چکے ہیں تو پھر میں دکھ کیوں کروں؟''

بروہی نے اسے سینے سے لگا لیا۔''پیارے بیٹے تمھیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ یہ گھر۔ یہ محلّہ۔ یہ شہر۔اپنا اسکول۔ اپنے دوست احباب۔ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔''

''میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔آپ بے فکر رہیں۔''

اور پھر اگلی ہی صبح بروہی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ بہت ہی خاموشی سے شہر چھوڑ چکا تھا۔ یہ بات کسی کو کانوں کان پتا نہ چلی کہ یہ سب کہاں چلے گئے۔

پورے شہر میں صرف معاویہ کو یہ بات معلوم تھی کہ ابوبکر کے گھر والے سب کہاں چلے گئے۔راتوں رات کہاں غائب ہوگئے۔

☆......☆

زندگی کا کام گزرنا ہے۔وہ محل میں بھی گزر جاتی ہے۔اور چھوٹے معمولی مکان میں بھی۔ایک بہت ہی چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر بروہی نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔وہ اپنا حرام پیسا کچھ بھی ساتھ نہ لایا تھا۔اب وہ چھوٹے سے ایک پرفضا قصبے میں رہا کرتے تھے، وہیں ایک چھوٹے سے اسکول میں ابوبکر نے داخلہ لیا تھا۔اب بروہی، محمد عمر کے نام سے ایک بڑھئی کی دکان پر بیٹھتا تھا۔وہ شلوار قمیص پہننے لگا تھا۔اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔وہ ابوبکر کو دیکھ کر اکثر اداس ہو جاتا تھا۔اس کا بچہ آسائشوں کا عادی تھا۔مگر اب وہ ایک تکلیف دہ زندگی گزار رہا تھا۔ابوبکر کی ماں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔شام میں اسکول سے آنے کے بعد ابوبکر بھی بڑھئی کی دکان پر چلا جاتا تھا۔ بڑھئی کا نام رضوان اللہ تھا۔ بہت ہی اچھا اور خدا ترس آدمی تھا۔جلد ہی وہ بروہی کا گہرا دوست بن گیا۔ابوبکر اس کو چاچا جی کہنے لگا۔

وقت گزرتا گیا گزرتا گیا۔۔۔۔یہاں تک کے ابوبکر نے میٹرک کرلیا۔اس نے معاویہ کو بہت مرتبہ یاد کیا مگر اب وہ سب کچھ بھلا چکا تھا۔اپنے ابو کی خاطر اسے وہ گھر وہ محلہ وہ دوست بھلانے ہی تھے۔اکثر رات میں جب وہ بستر پر لیٹتا تو ساری یادیں ایک

تواتر کے ساتھ اسکے ذہن میں آتی چلی جاتیں۔اور روتے روتے اس کا تکیہ بھیگ جاتا۔مگر وہ صبح اٹھتا تو ہشاش بشاش اٹھتا،اس کو خود بھی خوش رہنا تھا اور اپنے والدین کو بھی خوش رکھنا تھا۔

☆......☆

معاویہ اب کالج میں آچکا تھا۔ابوبکر اس کو اکثر یاد آتا تھا۔اس کا ابوبکر سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔معاویہ جب بھی نماز پڑھتا،ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کے حضور اپنے دوست اور اسکے والد کیلئے ضرور دعا کرتا کہ اے اللہ ان لوگوں کو استقامت دے۔ان لوگوں کیلئے حلال روزی کے دروازے کھول دے۔

اس شام جب وہ کالج سے تھکا ہارا گھر پہنچا تو فون کی گھنٹی بج اٹھی،اس نے فون ریسیو کیا تو حیران رہ گیا۔دوسری جانب ابوبکر تھا۔

''ہیلو ابوبکر کیسے ہو؟'' معاویہ خوشی سے چلا کر بولا۔

''اور انکل کیسے ہیں بروہی انکل۔کیا کر رہے ہیں آجکل؟''

''بروہی انکل نہیں محمد عمر انکل۔رضوان اللہ چاچا کی دکان پر ایک بڑھئی کی حیثیت سے،اور تمھارا دوست بھی شام میں وہیں پر ہوتا ہے۔''

اور انکل ٹھیک تو ہیں ابوبکر؟؟''

''پرسوں شام کو باس کے ساتھیوں نے ان کو ہلاک کر دیا جب وہ دکان سے آرہے تھے۔''

ابوبکر بولا۔معاویہ نے محسوس کیا وہ رو رہا تھا۔اس کا دل چاہا وہ بھی اس قدر چیخ چیخ کر روئے کہ زمین کے کونے کونے تک اس کی آواز پہنچ جائے۔

''پھر۔۔۔میرے بھائی ابوبکر۔۔پھر تم کس قدر دکھی ہوگے۔۔۔تم واپس یہیں آجاؤ ہم مل کر۔۔۔۔''

''نہیں معاویہ میں دکھی نہیں ہوں۔'' ابوبکر اپنا لہجہ مضبوط بنا کر بولا۔''دکھی تو میں تب ہوتا جب وہ باس کی طرح یا انسپکٹر ایاز کی طرح زندگی گزارتے ہوئے جان دیتے۔مجھے فخر ہے ان پر انہوں نے حلال رزق کماتے ہوئے جان دی۔'' معاویہ رونے لگا۔

''ابوبکر تم یہاں آجاؤ میرے بھائی۔۔کیا کرو گے وہاں رہ کر۔۔۔۔''

''نہیں معاویہ میں وہیں رہنا پسند کروں گا جہاں میرے والد نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔قابلِ فخر ایام۔میں وہاں آکر بروہی کا بیٹا بن کر زندگی گزارنے کے بجائے اس بات پر فخر محسوس کروں گا کہ یہاں محمد عمر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے جانا جاؤں۔اللہ حافظ معاویہ۔جب بھی دعا کرنا میرے والد کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھنا۔زندگی رہی تو تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔خواہ ایک بار ہی......'' سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

معاویہ کریڈل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''مجھے آپ پر فخر ہے انکل محمد عمر۔۔۔مجھے تم پر فخر ہے ابوبکر۔۔۔۔''

خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا

فریال یاور

اس بچی کی عمر ابھی بہت کم تھی مگر اس کی ذہانت کا اندازہ اس کے سوالات سے ہوتا تھا، بچی کی والدہ جو کہ خود بھی ایک نیک خاتون تھیں اس بچی کی تربیت پر خاص توجہ دیتیں اور اس کے ذہانت بھرے سوالات کا تسلی بخش جواب دیتیں تھیں۔

ایک بار بچی نے اپنی والدہ سے سوال کیا ''اماں جان اللہ تعالیٰ کی قدرتیں (اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں) تو ہم ہر وقت دیکھتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ ہم کو خود نظر نہیں آ سکتے''۔ بچی کی والدہ نے کہا ''میری بچی اگر ہم دنیا میں اچھے اچھے کام کریں گے اور اللہ کے احکامات پر عمل کریں گے تو قیامت کے دن اللہ ہم سے خوش ہوگا اور وہیں (جنت میں) ہمیں اللہ تعالیٰ نظر آئیں گے''۔

یہ بچی اپنی عادتوں میں دوسرے بچوں سے بالکل مختلف تھی دوسرے بچوں کی طرح نہ اس نے کبھی کسی کھیل کود میں حصہ لیا اور نہ ہی گھر سے باہر قدم نکالا، بس ہمیشہ اپنی والدہ کے پاس بیٹھی رہتی تھی

اور دین سے متعلق جو سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے وہ اپنی والدہ سے ان کے جواب پوچھتی۔ اس بچی کو دوسری لڑکیوں کی طرح نئے نئے کپڑوں اور زیور کا شوق نہیں تھا بلکہ اس نے ہمیشہ صفائی اور سادگی اختیار کی، ایک مرتبہ بچی کی والدہ نے اپنے کسی عزیز کی شادی میں جانے کے لیے بچی کے پہننے کیلئے مہنگے جوڑے اور زیور منگوائے مگر بچی نے وہ زیور اور کپڑے اپنی امی کو واپس کردیے اور خود صاف ستھرے مگر سادہ کپڑوں میں والدہ کے ساتھ شادی میں شرکت کی۔ بچی کے والدین نہایت نیک اور اللہ کی عبادت کرنے والے تھے اس لیے اس بچی کو بچپن ہی سے عبادت کا شوق تھا وہ اپنے والدین کے ساتھ شوق سے نماز پڑھتی اور عبادت کرتی، اس بچی کی عمر جب صرف پانچ سال تھی تو اس کی امی کی وفات ہوگئی جو اس بچی کے لے قیامت سے کم نہ تھی، بچی کے والد دین کے اہم کاموں میں بے حد مشغول رہتے تھے مگر اپنی بچی کی اداسی دیکھ کر پریشان ہوجاتے تھے اور اپنے کاموں میں سے تھوڑا وقت نکال کر بچی کے پاس آتے اور تسلی دیتے ساتھ ہی اسے نہایت قیمتی باتیں بھی بتاتے دین کا یہ کام اتنا آسان نہ تھا اس کام کے کرنے پر شریر لوگ اس بچی کے والد کو بہت پریشان بھی کرتے اور طرح طرح کی شرارت کر کے تکلیف پہنچاتے تھے مگر یہ ننھی سمجھدار بچی اپنے والد کو تسلی دیا کرتی اور اکثر اپنے والد کی تکلیف کو دیکھ کر رونے لگتی مگر اس بچی کے والد اپنی پیاری بیٹی کو سمجھاتے۔ ''میری بچی گھبراؤ نہیں اللہ تمہارے باپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا''۔

یہ ننھی ذہین بچی جگر گوشہ رسولؐ اور خاتون اوّل حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ تھیں۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اپنی عادات اور طور طریقوں، انداز گفتگو میں اپنے والد محترم حضرت محمدﷺ سے بہت ملتی جلتی تھیں، غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کرنے والی نہایت صبر کرنے والی اور بہت زیادہ عبادت کرنے والی تھیں۔ پیارے نبیؐ کی طرح آپؓ بھی اپنے تمام کام خود کیا کرتی تھیں، اپنے گھر میں خود ہی جھاڑو لگایا کرتیں تھیں اور خود ہی چکی پیس کر کھانا بنایا کرتی تھیں، اس کام کے لیے ان کے گھر میں کوئی خادم نہیں تھا۔ پیارے نبیﷺ کو اپنی صاحبزادی سے بے حد محبت تھی مگر اس کے باوجود سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو اپنے والدﷺ کی خوشی اور ناراضگی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ ایک مرتبہ پیارے نبیﷺ اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے ملنے ان کے گھر تشریف لے گئے، دیکھا دروازے پر رنگین پردے لٹکے ہوئے ہیں اور حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چاندی کے دو کنگن ہیں۔ آپﷺ یہ دیکھ کر واپس لوٹ گئے، حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا تو رونے لگیں اتنے میں پیارے نبیﷺ کے غلام ابورافع

وہاں پہنچ گئے اور رونے کی وجہ معلوم کی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ نے تمام ماجرا سنایا تو بولے حضورﷺ کو کنگن اور پردے ناپسند ہیں، حضرت فاطمہؓ نے فوراً دونوں چیزوں کو پیارے نبیﷺ کی خدمت میں بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے انہیں راہ خدا میں دیا۔ پیارے نبیﷺ بے حد خوش ہوئے اور اپنی بچی کے لیے دعائے خیر کی پھر ان چیزوں کو بیچ کر قیمت اصحاب صفہ کی ضرورت کے لیے دے دی۔

ایک دفعہ ایک بوڑھا آدمی مسلمان ہوا، حضورﷺ نے اسے دین کے ضروری احکام سمجھائے پھر اس سے پوچھا تیرے پاس کچھ مال بھی ہے اس نے کہا خدا کی قسم قبیلے کے تین ہزار آدمیوں میں سب سے غریب میں ہی ہوں۔ حضورﷺ نے صحابہ کرامؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا "تم میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا؟"۔

حضرت سعد بن عبادہؓ اٹھے اور کہا یارسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں اس کو دیتا ہوں۔" حضورﷺ نے فرمایا تم میں سے کون ہے جو اس کا سر ڈھانک دے۔" سیدنا علی مرتضیٰؓ اٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر اس اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔" پھر حضورﷺ نے فرمایا۔ کون ہے جو اس کی خوراک کا بندوبست کرے؟" حضرت سلمان فارسیؓ نے اعرابی کو ساتھ لیا اور اس کی خوراک کا انتظام کرنے نکلے چند گھروں سے دریافت کیا لیکن وہاں کچھ نہ ملا پھر حضرت فاطمہؓ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا کون ہے؟ انہوں نے سارا واقعہ سنایا اور التجا کی کہ "اے اللہ کے رسولﷺ کی بیٹی اس مسکین کی خوراک کا انتظام کردیجیے"۔

سیدہ فاطمہؓ نے فرمایا "ارے سلمانؓ خدا کی قسم آج ہم سب کو تیسرے وقت فاقہ ہے، دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی۔ جاؤ میری یہ چادر یہودی کے پاس لے جاؤ اور کہو فاطمہؓ بنت محمدؐ کی یہ چادر رکھ لو اور اس غریب انسان کو تھوڑے سے اناج دے دو"

حضرت سلمانؓ اعرابی کو ساتھ لے کر یہودی کے پاس پہنچے اس کو سب بتایا تو وہ حیران رہ گیا اور پکار اٹھا "اے سلمانؓ خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے، گواہ رہنا کہ میں فاطمہؓ کے باپﷺ پر ایمان لایا۔ اس کے بعد کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کو دیا اور چادر بھی حضرت فاطمہؓ کو واپس کردی وہ لے کر حضرت فاطمہؓ کے پاس پہنچے سیدہ فاطمۃ الزہرہؓ نے اپنے ہاتھ سے اناج پیس کر جلدی سے روٹی پکائی اور حضرت سلمانؓ کو دی، انہوں نے کہا اس میں سے کچھ بچوں کے لیے رکھ لیں۔ جواب دیا۔ "سلمانؓ جو چیز خدا کی راہ میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے جائز نہیں"۔ حضرت سلمانؓ روٹی لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے۔ حضورﷺ نے وہ روٹی

اعرابی کو دی پھر حضورﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے سر پر محبت سے اپنا ہاتھ پھیرا اور آسمان کی طرف دیکھ کر دعا مانگی۔

''یا اللہ فاطمہؓ تیری کنیز ہے اس سے راضی رہنا''۔

جس طرح پیارے نبیﷺ اور آپ کے پیارے ساتھیوں نے کئی کئی دن فاقے کیے اسی طرح سیدہ فاطمۃ الزہراؓ نے بھی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ فاقے کیے مگر ہمیشہ صبر کیا اور اپنے شوہر حضرت علیؓ سے سوال نہ کیا۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ گھر تشریف لائے اور کچھ کھانے کو مانگا تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا کہ آج تیسرا دن ہے کہ گھر میں جو کا ایک دانہ تک نہیں حضرت علیؓ نے فرمایا: ''اے فاطمہ تم نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟'' سیدہ فاطمۃ الزہراؓ نے فرمایا اے میرے محترم خاوند میرے والدﷺ نے رخصتی کے وقت نصیحت کی تھی کہ میں کبھی سوال کر کے آپؓ کو شرمندہ نہ کروں'' کیوں کہ جس وقت حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ کے ساتھ شادی ہوئی حضرت علیؓ کے پاس پیسوں کی تنگی تھی اور ان کا زیادہ تر وقت پیارے نبیﷺ کے ساتھ جہاد میں گزرتا تھا لہٰذا جو کچھ مال غنیمت میں ملتا تھا حضرت فاطمہؓ اور آپؓ کے بچوں کا اسی پر گزر بسر ہوتا تھا۔

ایک دفعہ دوپہر کے وقت رسول کریمﷺ بھوکے گھر سے نکلے راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ملے وہ بھی بھوکے تھے تینوں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے کھجوروں کے باغ میں پہنچے۔ حضرت ابوایوبؓ خوشی میں ان سے لپٹ گئے فوراً کھجوروں کا ایک گچھا توڑ کر لائے اور کھانے کو پیش کیا اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی پینے کے لیے دیا اور پھر خود گھر کے اندر جا کر ایک بکری ذبح کی اور اسے بھون کر حضورﷺ کی خدمت میں لائے۔ پیارے نبیﷺ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا یہ فاطمہؓ کو بھجوا دو انہیں کئی دن سے فاقہ ہے''۔

حضرت امام حسنؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی والدہ کو صبح سے شام تک عبادت کرتے اور خدا کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا مگر انہوں نے کبھی اپنی دعاؤں میں اپنی ضرورت کے لیے کچھ نہیں مانگا۔

حضورﷺ کو جیسے اپنی بیٹی سے محبت تھی اسی طرح اپنے داماد اور نواسوں سے بھی پیار تھا۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بیٹوں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو بہت محبت سے بوسے دیتے (چومتے) اور اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتے تھے۔

وصال نبوی سے کچھ دن پہلے حضرت فاطمۃ الزہراؓ حضورﷺ کی خیریت معلوم کرنے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف لائیں۔ حضورﷺ نے نہایت شفقت سے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور ان کے

کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی جسے سن کر وہ رونے لگیں پھر حضورﷺ نے کوئی اور بات ان کے کان میں کہی اور وہ ہنسنے لگیں جب واپس جانے لگیں تو حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا۔ ''اے فاطمہؓ تیرے رونے اور ہنسنے میں کیا راز تھا''۔حضرت فاطمہؓ نے فرمایا جو بات حضورﷺ نے چھپائی ہے میں وہ نہیں بتاوں گی۔ ''حضورﷺ کی وفات کے بعد ایک دن حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھی۔حضرت فاطمہؓ نے فرمایا پہلی دفعہ حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ پہلے جبریلؑ امین سال میں ہمیشہ ایک مرتبہ قرآن پاک سنا کرتے تھے اس سال معمول کے خلاف دو بار سنا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آگیا ہے''۔یہ سن کر میں رونے لگی۔ پھر حضورﷺ نے فرمایا تم میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھ سے ملو گی اور تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی''۔اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔

پیارے نبیﷺ کی وفات سے قبل بے چینی دیکھ کر حضرت فاطمہؓ کو بہت تکلیف ہوئی اور بے چین ہو کر فرمایا ''ہائے میرے باپﷺ کی بے چینی'' حضورﷺ نے یہ سن کر فرمایا۔ ''آج کے بعد تمہارا باپ بے چین نہیں ہوگا''۔حضورﷺ کے وصال کے بعد حضرت فاطمہؓ ہر وقت غمزدہ رہنے لگیں اور چھ ماہ بعد ہی رمضان المبارک 11 ہجری کو وفات پا گئیں۔

آپ کی اولادیں حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت زینبؓ، حضرت محسنؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ ہیں۔آپؓ سے اٹھارہ احادیث مروی ہیں۔

☆......☆......☆

ایک موقع

ایک دعوت میں ایک خاتون کے ہار کو مہمانوں نے بہت سراہا۔آخر کار لوگوں کے اصرار پر اس خاتون نے اپنا ہار اتار کر میز پر رکھ دیا۔کھانا کھاتے کھاتے اچانک خاتون نے دیکھا کہ ہار غائب ہے۔ یہ دیکھ کر محفل پر سناٹا طاری ہوگیا۔آخر کار میزبان نے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ اس محفل میں کوئی صاحب چور بھی ہیں۔ میں انہیں ایک موقع دیتا ہوں۔وہ میز پر رکھے چاندی کے کٹورے میں خود ہی ہار ڈال دیں۔''

یہ کہہ کر میزبان نے روشنیاں بند کر دیں۔چند منٹ بعد ہال روشن کیا گیا تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میز پر سے چاندی کا کٹورا بھی غائب تھا۔

مرسلہ:حمزہ حفیظ،عاقب تنویر، ہیڈ راجکاں

اوپر نیچے گول گول

پچاک ک ک...... مانی کے بچے چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔ سارم نے اوپر جھولے پر بیٹھے مانی کو دھمکی دی۔ مانی جس نے سارم سمیت دیگر اور بھی بچوں کو جھولے پر سے پانی سے بھری تھیلیاں ٹکائی تھیں۔ اب ایک اور پانی کی تھیلی تیار کر چکا تھا۔ تمام بچے اس اوپر نیچے گول گول گھومتے جھولے سے جہاں لطف اندوز ہو رہے تھے وہیں مانی کی اس شرارت کی نظر ہو رہے تھے۔

تمام بچے بڑے ضبط سے مانی کی شرارت کو برداشت کر رہے تھے مگر جیسے ہی جھولا رکا تمام بچوں نے اتر کر مانی کو پکڑ لیا اور پھر خوب دھو دھو کر پٹائی کی۔ تب مانی کو پتہ چلا کہ مذاق اتنا ہی کیا جائے جتنا کہ دوسرا برداشت کر سکتا ہو ورنہ پھر حشر کے لیے تیار ہو جائے۔

چلتی کا نام سائیکل

ایک سائیکل آپ کے ڈھیر سارے کام آسانی سے نمٹانے میں آپ کی مدد کرتی ہے۔ کبھی سودا لانے میں تو کبھی اسکول جانے میں۔ کبھی شام کے وقت دوستوں کے ساتھ کھیلنے میں۔ آیئے جانتے ہیں کہ ایک سائیکل میں کتنے حصے ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ پوری سائیکل تیار ہوتی ہے اور کارآمد سواری بن جاتی ہے۔

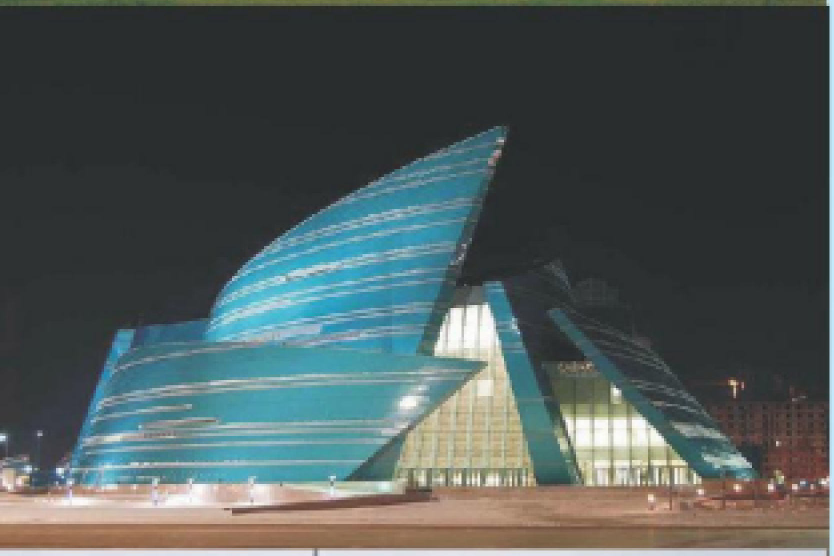

آستانہ

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد کئی ناموں سے معروف ہونے والا آزاد قازقستان کا دوسرا بڑا شہر اور دارالحکومت جسے ''اکمولا'' بھی کہا جاتا رہا۔ 1998ء کے بعد سے ''آستانہ'' کے نام سے دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ یہ قلعہ نما شہر دریائے ایشم کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت عموماً انتہائی سرد ہوتا ہے۔ اسے دنیا کا دوسرا سرد ترین دارالحکومت بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں سردیوں میں منفی 35 تا منفی 40 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت گر جاتا ہے۔

چوں کہ یہ پہلے سوویت یونین کا حصہ تھا، لہٰذا سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اس دور کی تمام عمارتیں مسمار کر کے یہاں جدید طرز کی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اسی وجہ سے یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت عمارتیں سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں، ان عمارتوں میں یہاں کا مینار Bay terek یہاں کا اہرام امن، پارلیمنٹ ہاؤس اور سب سے بڑھ کر یہاں کا ہوائی اڈہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں سیر وسیاحت کے لیے متعدد پارک، عجائب گھر اور یادگاریں بھی موجود ہیں۔ بیس بال یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے لہٰذا متعدد مساجد کے علاوہ یہاں ایک اسلامک سینٹر بھی موجود ہے جو نہ صرف قازقستان کا بلکہ وسطی ایشیاء کا سب سے بڑا اسلامک سینٹر ہے، یہاں مسجد کے علاوہ بہت بڑا مدرسہ اور کتب خانہ بھی موجود ہے جہاں طلبہ و طالبات اسلامی تحقیق میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ یہ اسلامک سینٹر امیر قطر کے تعاون سے تعمیر کیا گیا جو آج بھی قازقستان اور قطر کی دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

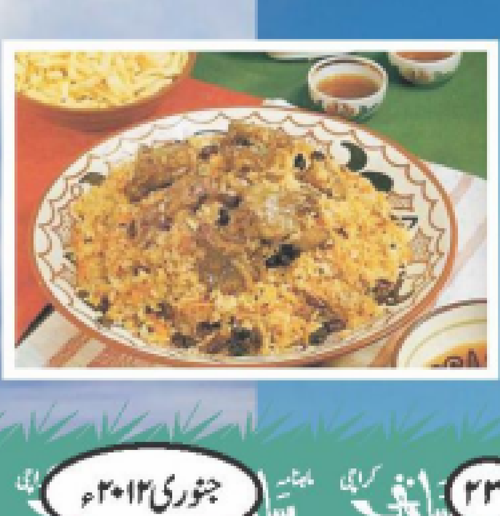

وہ شکریہ کہنا بھول گئی

گل رعنا صدیقی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی قصبے میں ایک ننھی لڑکی رہتی تھی جب کبھی وہ کسی کی دعوت میں جاتی تو آخر میں میزبان کا شکریہ ادا کرنا ہمیشہ بھول جاتی تھی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی دعوت کے اختتام پر خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہمیشہ میزبان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں دعوت دی اور ہمیں شریک ہونا بہت اچھا لگا۔ لوسی بھی یہ بات جانتی تو تھی مگر کہنا ہمیشہ بھول جاتی تھی۔

''لوسی کو تمیز تہذیب تو چھو کر بھی نہیں گزری''۔ مسز براؤن نے کہا۔

''کل میں نے اسے اپنے بچوں کے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی اور وہ چائے پی کر ایک لفظ کہے بغیر گھر چلی گئی''۔ ''بالکل صحیح! میں اسے اپنے بچوں کے ساتھ پکنک پر لے گئی تھی میں نے اونٹ کی سواری کے لیے اس کی طرف سے پیسے بھی ادا کیے پھر بھی وہ بغیر شکریہ کہے گھر چلی گئی۔ بہت بداخلاق لڑکی ہے''۔ مسز جونز نے ہاں میں ہاں

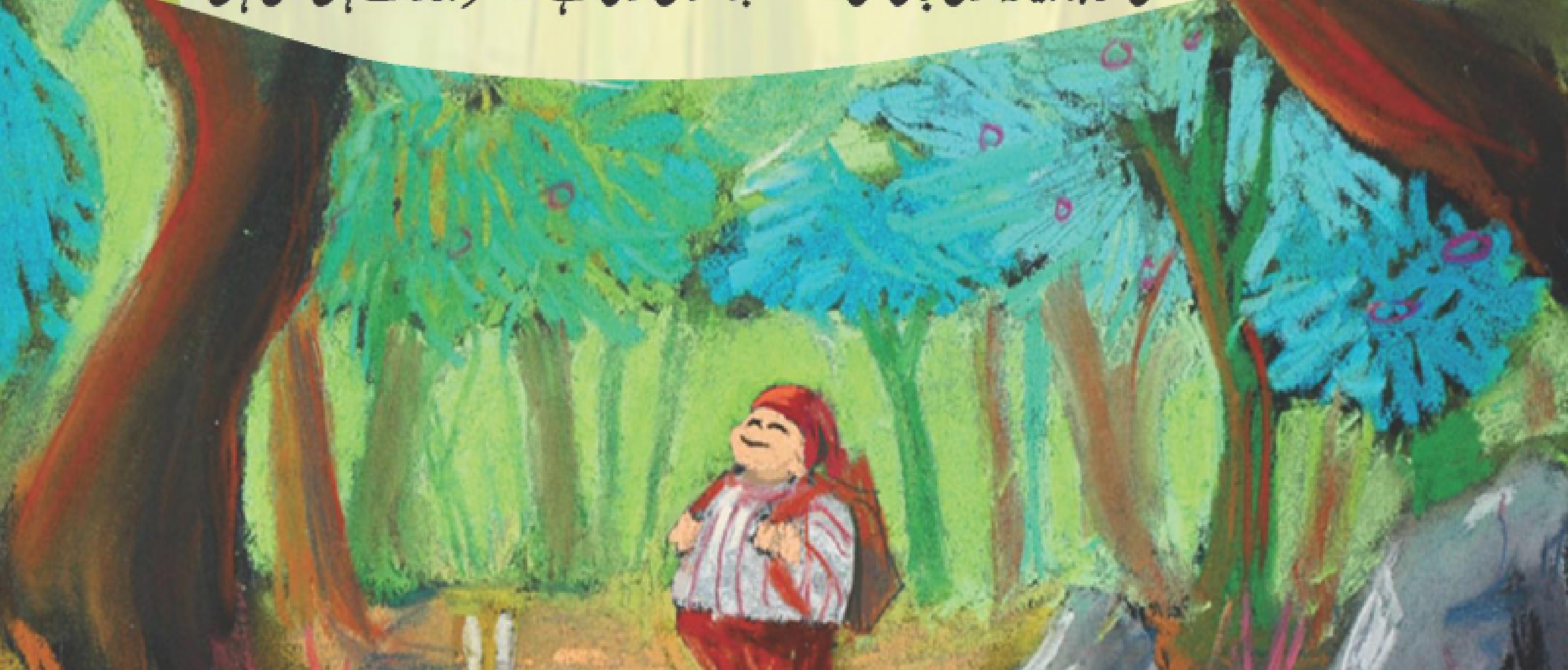

سند باد کا سفر

انعامی سلسلہ نمبر13

ساتھیو! سند باد کی جانب سے آپ کے لیے ساتھی لایا ایک زبردست انعامی سلسلہ۔ بس آپ رسالہ کو غور سے پڑھیں اور ان جملوں کو ان صفحات پر تلاش کر کے صحیح جوابات ہمیں روانہ کریں۔ کسی بھی تین خوش نصیب ساتھیوں کو ہم کرائیں گے سند باد کی ایک دن کی مفت سیر...... اور بیرونِ شہر رہنے والوں دو خوش نصیبوں کو ملے گا خوبصورت ساتحفہ!

۱۔ سوچیے سیکھیے اور کچھ بڑا کام کر گزرنے کی ٹھان لیجیے۔

☐ ٢٧ ☐ ١٧ ☐ ٧

۲۔ جس سے مشورہ کیا جائے اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

☐ ١٣ ☐ ٣٢ ☐ ٢٣

۳۔ ہر چیز میں ملاوٹ، ہر دفتر میں رشوت

☐ ٤٥ ☐ ٥٠ ☐ ٥٤

کوپن ''سند باد کا سفر''

انعامی سلسلہ نمبر13

نام: ____________________

کلاس: ____________________

مکمل پتہ: ____________________

فون نمبر: ____________________

ای میل: ____________________

ملائی۔
ایک دن لوسی اپنی نانی کے ہاں سے جنگل کے راستے گھر واپس آ رہی تھی کہ ایک ننھا منا آدمی کہیں سے دوڑتا ہوا آیا اور اس سے ٹکرا گیا۔
''افوہ''۔ لوسی نے غصے سے کہا۔''ذرا دیکھ کر چلا کرو۔تم نے اس بیگ میں موجود سارے انڈے توڑ دیے جو میری نانی نے مجھے ناشتے کے لیے دیے تھے۔''اوہ، میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ پتا نہیں، تم مجھے پہچانی یا نہیں۔ میں ایک بونا ہوں۔ میں تمہارا نقصان کرنے کی تلافی کرنا چاہتا ہوں''۔ وہ کیسے؟ لوسی نے پوچھا۔''کیا تم آج سہ پہر دعوت پر آنا پسند کرو گی؟''بونے نے کہا۔
''میں اپنے چھ دوستوں کو چائے کی دعوت دے رہا ہوں کیوں کہ آج میری سالگرہ ہے۔ اگر تم شریک ہونا پسند کرو تو تین بجے یہاں برگد کے درخت کے پاس آ جانا''۔ اوہ ہاں۔ کیوں نہیں۔ لوسی نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔
گھر جا کر اس نے اکیلے ہی دن کا کھانا کھایا کیوں کہ اس کی امی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ڈھائی بجے تیار ہو کر وہ برگد کے درخت کی طرف چل پڑی۔ بونا وہاں موجود تھا۔ وہ اسے جنگل کے بیچ ایک آبادی میں لے گیا جہاں عجیب وغریب چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ بونا اسے اپنے گھر لے گیا۔ یہاں چھ بونے موجود تھے۔ سب نے لوسی سے ہاتھ ملایا اور خوشی کا اظہار کیا۔ میز پر عظیم الشان کیک موجود تھا۔ لوسی نے اتنا خوب صورت کیک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چائے کے ساتھ سولہ مختلف طرح کے سینڈوچ، پانچ طرح کے بن، سات طرح کے بسکٹ اور سات رنگ کی جلیبیاں تھیں۔ اس کے علاوہ آئس کریم الگ تھی۔
چائے کے بعد انہوں نے مل کر بہت سارے کھیل کھیلے۔ آخر میں سب نے ایک ڈبے میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک تحفہ حاصل کیا۔ لوسی کو چھوٹا سا میوزیکل بکس ملا وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر ایک ایک کر کے سب مہمان فراخ دل بونے سے ہاتھ ملانے لگے۔ ہمیں دعوت میں بلانے کا بہت شکریہ۔ ہمیں بہت مزہ آیا۔ وہ سب اخلاق سے کہتے۔ پھر لوسی کے خدا حافظ کہنے کی باری آئی۔ اس نے بونے سے ہاتھ ملایا اور گھر چل پڑی۔ حسب معمول وہ بونے کا شکریہ ادا کرنا بھول گئی تھی۔
مگر جنگل کا راستہ اسے پھر بونے کی بستی میں واپس لے آیا۔ وہ ایک بار پھر بونے کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔
بونا یہ امید کرتے ہوئے دروازے پر آیا کہ ننھی لڑکی کو کچھ تمیز تہذیب کا خیال آ گیا ہوگا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوگی مگر وہ شکریہ ادا کرنے نہیں آئی تھی۔
''کیا مصیبت ہے''۔ اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ''میں غلطی سے واپس پلٹ کر پھر یہیں آ گئی''۔ وہ

پھر چل پڑی مگر صرف بیس منٹ بعد ہی وہ واپس اسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی، کتنی عجیب بات تھی۔

بونا پھر یہ سوچتے ہوئے دروازے پر آیا کہ اس بار وہ اس سے معافی مانگنے آئی ہوگی کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا بھول گئی تھی مگر نہیں۔ اس نے غصے سے پاؤں پٹخے اور واپس چلی گئی۔ مگر وہ جتنی بار بھی جنگل سے نکلنے کی کوشش کرتی، واپس پلٹ کر وہیں پہنچ جاتی۔ وہ خوفزدہ ہوگئی اور بونے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے بلایا۔ ''پتا نہیں کیا ہو رہا ہے، میں جو بھی راستہ پکڑ کر گھر جانا چاہتی ہوں وہ راستہ مجھے واپس یہیں لے آتا ہے''۔

''میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ بھول رہی ہو''۔ بونے نے کہا۔ ''ہمارے قصبے سے نکلنے والے راستے عجیب ہیں۔ اگر کوئی مہمان کوئی چیز بھول جائے تو راستہ اسے واپس یہیں لے آتا ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا اپنی چھتری بھول گئے تھے۔ راستہ ان کو واپس یہاں لے آیا تاکہ وہ اسے اٹھا سکیں''۔

''لیکن میں تو کوئی چیز نہیں بھولی''۔ لوسی نے غصے سے کہا۔ ''کیوں کہ میں اپنے ساتھ کچھ لائی ہی نہیں تھی، نہ چھتری، نہ بیگ، نہ ٹوپی''۔

''عجیب بات ہے''۔ بونے نے کہا۔ ''یہ تو درست ہے کہ تم ایسی کوئی چیز نہیں لائی تھیں جو تم بھول کر جا سکو''۔ ''پتا نہیں، سوچو آخر میں کیا بھول رہی ہوں؟'' لوسی نے کہا۔ بونے نے غور کیا پھر اچانک اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا، وہ ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے اور یہ بہت عجیب بات ہے کہ راستے تمہیں اس وجہ سے بار بار لوٹاتے رہے۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ہو بھی نہیں سکتی''۔ اور وہ کیا بات ہے؟۔ لوسی نے حیران ہو کر کہا۔ ''میں بتاتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم بھی یہ سن کر شرمندہ ہو جاؤ گی''۔

''اب بتا بھی دو''۔ لوسی بے صبری سے چلائی۔

''تم آداب بھول گئی تھیں''۔ بونے نے کہا۔ ''تم نے دعوت میں شرکت کے بعد میرا شکریہ ادا نہیں کیا جب کہ باقی سب مہمانوں کو یاد رہا کیوں کہ میرے سب دوستوں کی اچھی تربیت ہوئی ہے مگر تم نے کچھ نہیں کہا شاید تمہاری تربیت اچھی نہیں ہوئی۔ چچ چچ...... بے چاری بچی۔'' بونے نے افسوس سے کہا۔ یہ سن کر لوسی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ ''میری تربیت اچھی ہوئی ہے، میں ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں''۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ مجھے شکریہ کہنا چاہیے تھا اور میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں بھول گئی۔ یہ میری بدتہذیبی تھی۔

''مجھے اتنی اچھی دعوت دینے کا شکریہ بونے! مجھے بہت مزہ آیا''۔ کوئی بات نہیں۔ بونا خوش ہو کر بولا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا کہ تم میری دعوت میں

آ کر بور ہوئی ہو جب ہی تو چپ چاپ چلی گئیں۔
میں یہ جان کر خوش ہوا کہ تم نے انجوائے کیا۔
''خدا حافظ! پھر ملیں گے''۔ لوسی نے بونے سے ہاتھ ملاتے ہوئے اخلاق سے کہا تاکہ اپنی بدتہذیبی کا ازالہ کر سکے۔
''اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے، میں اپنی سالگرہ کا کیک چکھانے کے لیے لاؤں گی''۔ وہ ایک دفعہ پھر گھر کی طرف چل پڑی اور اس دفعہ بڑی آسانی سے گھر پہنچ گئی۔
اگلے ہفتے اس کی سالگرہ تھی۔ وہ اپنی سالگرہ کے کیک کا ٹکڑا لے کر جنگل کی طرف گئی مگر اسے بونوں کی بستی جانے والا راستہ نہیں مل سکا۔
لیکن ایک بات وہ زندگی بھر نہیں بھولی۔ دعوتوں میں شرکت کے بعد میزبان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

☆......☆......☆

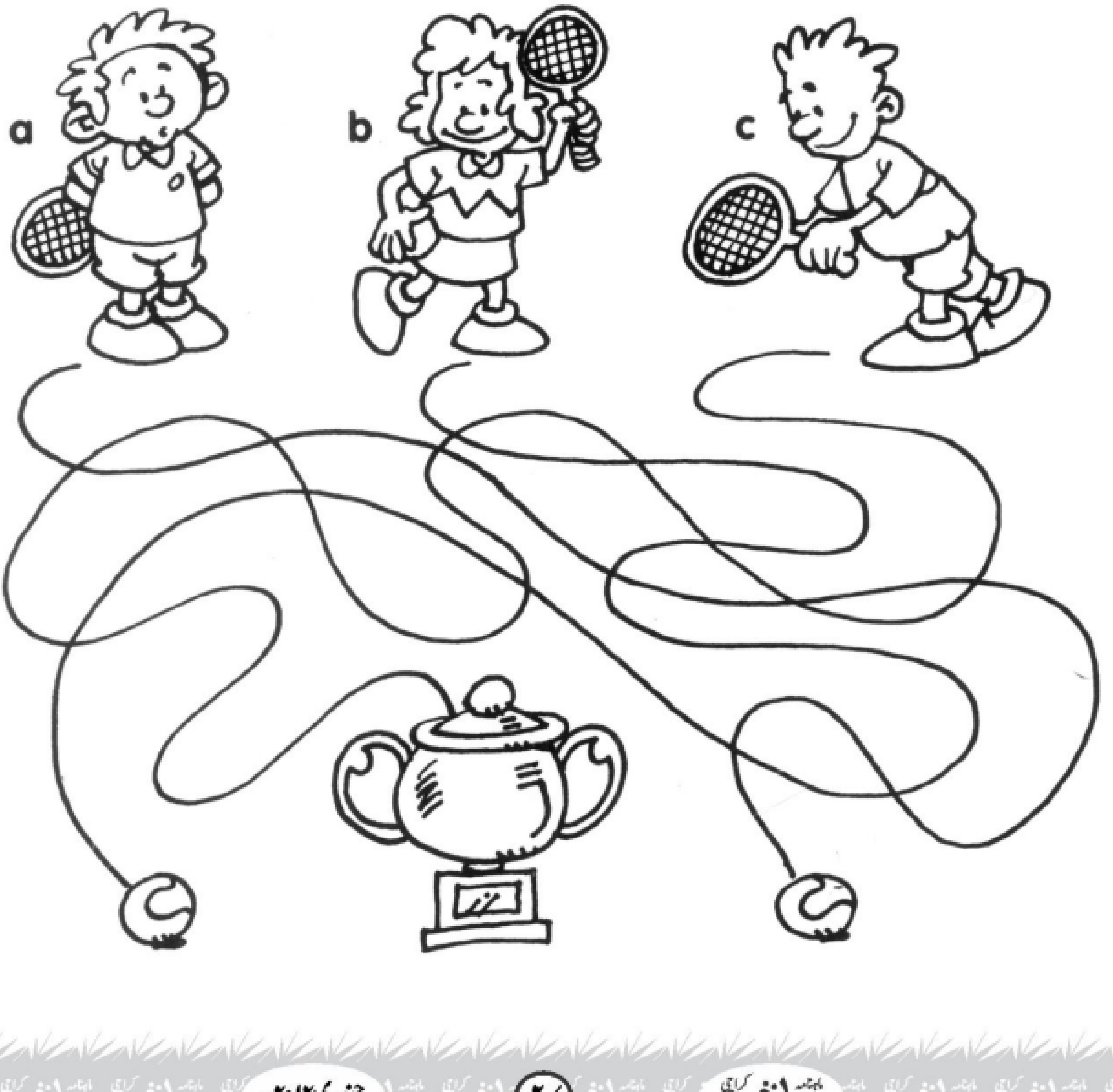

حمدِ باری تعالیٰ

ضیاءالحسن ضیاؔ

رہتا ہے میرے لب پر تیرا ہی نام یارب
تونے بنائے میرے سب بگڑے کام یارب

مالک ہے تو ہمارا ، خالق ہے تو ہمارا
مشکل نے جب بھی گھیرا ہم نے تجھے پکارا

حاصل ہے ہم کو مولا، ہر دم ترا سہارا
گرنے نہیں ہے دیتا پیہم ترا سہارا

تیرا نہ کوئی ہم سر اعلیٰ ہے ذات تیری
کیسے بیاں ہوں ہم سے یارب صفات تیری

ہر شے میں دیکھتے ہیں، یارب ترا ہی جلوہ
تیرا ہر ایک بندہ کرتا ہے تجھ کو سجدہ

بھٹکے ہوؤں کو تو ہی منزل دکھا رہا ہے
یارب سفینے سب کے تو ہی چلا رہا ہے

تیرا ضیاؔ ہے تجھ سے ہر آن ہی سوالی
علم و ہنر سے بھر دے تو اس کی جھولی خالی

درمیانی راستہ

اعظم طارق کوہستانی

مجھے کوئی درمیانی راہ نکالنی تھی۔ اب یہ درمیانی راہ کون سی ہو...... اس پر مجھے دماغ لڑانا تھا

میں ڈائمنڈ پبلک اسکول کا ایڈمنسٹریٹر ہوں ...... لیکن شروع میں ایسا نہیں تھا...... جب یہ اسکول میں نے کھولا تو اس وقت لگن اور بلند عزائم کی بدولت تمام مشکلیں آسان ہوگئی تھیں۔ اگر میں یہاں یہ کہوں کہ اس عزم اور لگن کا نام ''زاہد حسین'' تھا، تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا۔ زاہد حسین میرا بہترین دوست اور مددگار تھا۔ وہ ایک بہترین منتظم ہونے کے علاوہ ایک بہترین استاد بھی تھا...... اس کی اسی مہارت کی بدولت اسکول میں طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ایک وقت ایسا آیا جب ڈائمنڈ پبلک سیکنڈری اسکول پورے علاقے کا بہترین اسکول شمار ہونے لگا۔ اس میں اللہ کی رحمت کی بدولت زاہد حسین کی کوششوں کا بڑا عمل دخل تھا...... اور پھر وہی ہوا جو

اس دنیا کا دستور ہے......لوگ آتے اور چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن زاہد حسین بھی ادارہ چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ ایک سرکاری ادارے میں ایک اہم عہدے پر افسر لگ گئے۔
اس بات کا ذکر انہوں نے مجھ سے پہلے ہی کر دیا تھا کہ وہ ادارہ چھوڑ کر کسی بھی وقت جا سکتے ہیں۔ اس لیے میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔
لیکن......! انہوں نے ایک کام یہ کر دیا تھا کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے اسکول میں استاد لگوا دیا تھا۔ ان کا بھتیجا بلاشبہ اپنے چچا پر گیا تھا۔ اس میں واقعی قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔
لیکن......! میرے اسکول میں چند استاد ایسے بھی تھے۔ جو زاہد حسین کے بھتیجے کامران سے زیادہ قابل تھے۔ وہ انتظامی امور میں بھی طاق تھے......خصوصاً میں جب کبھی کامران اور دوسرے اساتذہ کے درمیان موازنہ کرتا تو مجھے ''ضمیر صاحب'' ان میں سب سے زیادہ لائق فائق لگتے تھے۔
چند عرصہ گزرنے کے بعد مجھے لگا کہ میں اسکول کو وہ توجہ نہیں دے پا رہا ہوں جو کہ مجھے دینی چاہیے...... اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ اسکول کا کوئی انچارج بنا دوں جو کہ تمام معاملات سنبھالے اور میں خود اس کی نگرانی کرتا رہوں۔ اب پرنسپل کس کو بناؤں؟ اس سوال نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا تھا اور آگے آنے والے ایک واقعے نے تو سچ مچ میری دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

☆......☆

وہ ہفتہ کا دن تھا...... میں اسکول کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔
''السلام علیکم!'' فون کرنے والے نے پہل کی۔
''وعلیکم السلام! کیا حال ہے زاہد بھائی!'' میں نے آواز پہچان لی تھی۔ وہ میرے بہترین اور عظیم دوست زاہد حسین کی آواز تھی۔ اُس کی آواز میں ہمیشہ کی طرح چہکار تھی۔
''اللہ کا شکر ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں...... میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''
''اصل میں ایک خبر اُڑتے اُڑتے سنی تھی کہ تم اسکول کا چارج کسی اور کو دے کر خود نگرانی کرنا چاہتے ہو۔''
''جی جناب! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' میں نے کہا...... مجھے معلوم تھا کہ اسے کامران نے ہی بتایا ہوگا۔
''تو پھر یقیناً تم نے کسی کو منتخب کر لیا ہوگا۔'' زاہد حسین نے کہا۔
''نہیں ابھی فی الحال نہیں کیا......لیکن آئندہ ایک دو دنوں تک اُمید ہے۔'' میں نے بتایا۔
''کامران کافی ذہین ہے...... دیکھ لینا اسے بھی۔'' زاہد حسین نے گویا سفارش کرنی چاہی۔
''دیکھتے ہیں ...... لیکن تمہیں پتہ ہے کہ میں ''میرٹ'' پر کتنا یقین رکھتا ہوں۔'' میں نے

میرٹ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''لیکن ...... تمہیں بھی معلوم ہوگا کہ میں کتنی جلدی ناراض ہونے والوں میں سے ہوں۔'' زاہد حسین نے ناراض ہونے کی دھمکی دی۔ میرے لیے یہ دھمکی کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

زاہد حسین نے اللہ حافظ کہہ کر فون تو بند کر دیا لیکن مجھے ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ میری پریشانی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ زاہد حسین نا صرف میرا بہترین دوست تھا بلکہ وہ میرا محسن بھی تھا اور محسن کی بات ٹالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا اس قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو وہ بخوبی جانتے ہیں۔ ضمیر صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مقابلے میں کامران اس عہدے کا اتنا اہل نظر نہیں آرہا تھا۔ جب کہ دوسری جانب زاہد حسین کے میری ذات پر بے شمار احسانات مجھے کامران کی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ اگر دنیاداری کے تقاضے سے پرکھا جاتا تو اس اسکول کو آج اس مقام پر پہنچانے والا اگر مجھ سے ایک عہدے کا تقاضا کر رہا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

لیکن ......!

اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینے کا احساس رکھنے والے بہرحال ان معاملات میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ مجھے کوئی درمیانی راہ نکالنی تھی۔ اب یہ درمیانی راہ کون سی ہو...... اس پر مجھے دماغ لڑانا تھا۔

☆......☆

یہ ایک کشادہ ریسٹورنٹ تھا۔ بیرے انتہائی برق رفتاری کے ساتھ سروس مہیا کرنے میں مصروف تھے۔ گول کاؤنٹر کے پیچھے موٹی توند والا شخص بیٹھا ہوا پیسے گن رہا تھا۔ اس کے سامنے چار سے پانچ مختلف رنگوں کے فون رکھے تھے۔ جب کہ اس کے پیچھے کسی بزرگ کی تصویر دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔

زاہد حسین کو میں نے ہی اس ریسٹورنٹ میں بلایا تھا...... میرے ذہن میں ایک درمیانی راستہ نکل آیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ مجھے اس میں کس حد تک کامیابی میسر آتی ہے۔ زاہد حسین ایک دین دار اور باشرع آدمی تھے ان سے خلاف شرع (شریعت کے خلاف) شاید ہی کوئی کام سرزد ہوا ہو۔

لیکن! اب مسئلہ یہ تھا کہ اس معاملے میں وہ کامران کو حقدار سمجھتے تھے......اور یقیناً اگر میں بھی ان کی جگہ ہوتا تو شاید یہ ہی سمجھتا لیکن اگر وہ میری جگہ ہوتے تو ان کی بھی وہی رائے ہوتی جو اس وقت میری تھی۔

میں وہاں پہنچا تو اس وقت تک زاہد حسین نے چائے کا آرڈر دے دیا تھا......اور تھوڑی دیر میں ہی چائے پیش کر دی گئی۔

اتنی جلدی چائے کے آنے پر میں نے دل ہی دل میں سوچا......شاید چائے فریج سے نکال کر لایا

ہے۔لیکن چائے گرم تھی۔

''خیریت تو تھی...... آج اس ریسٹورنٹ میں بلانے کی کوئی خاص وجہ۔'' زاہد حسین چائے کی چسکی لیتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئے۔

''اصل میں ...... میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ضرور، مجھے خوشی ہوگی۔'' زاہد حسین کے چہرے پر تبسم آ گیا۔

''لیکن اس سے پہلے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں چند احادیث سناؤں ......'' شاید تم نے سنی ہو......مگر دہرا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو زاہد حسین پہلو بدل کر سنجیدہ ہو گئے۔

''ضرور سنائے۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے مشورہ کیا جائے اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ (سنن ابی داؤد حدیث ۵۱۳) اور اسی طرح ایک اور جگہ نبی انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' جس سے مشورہ لیا جائے وہ دیانت داری سے مشورہ دے۔'' (ابن ماجہ جلد: ۲ حدیث ۱۵۴۰) اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوتا، مشورہ لینے والا پشیمان نہیں ہوتا اور میانہ روی اختیار کرنے والا فقر و غریبی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ (الجمع الصغیر صفحہ ۲۰۴)

مجھے امید ہے کہ اب تم مجھے بہتر مشورہ دے سکو گے۔'' میں نے آخر میں مسکراتے ہوئے کہا...... جواب میں زاہد حسین کی خاموشی کا مطلب ان کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی۔

''میرا ایک دوست ایک فیکٹری میں G . M (جنرل منیجر) کے عہدے پر فائز ہے اور اس نے فیکٹری میں ملازمین کا ٹھیکہ ایک شخص کو دیا ہے، اس موقع پر اس کے ایک دوست نے اپنے کسی رشتہ دار کے لیے سفارش کی کہ ٹھیکہ اسے دے دیا جائے'' ...... میں سانس لینے کے لیے رکا...... زاہد حسین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے ایک لمحے کے لیے بھی خاموش رہنا گوارا نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد سب سننا چاہتا تھا۔

''وہ G . M (جنرل میجر) اس کی بات بھی نہیں ٹال سکتا، کیوں کہ وہ اس کا بہترین دوست ہے۔ لیکن دوسری جانب حق تلفی ہو رہی ہے اور تم تو جانتے ہو اس دور میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کسی کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتے۔'' میں نے تفصیل بتائی۔

''اور اس معاملے میں تمہیں میرے مشورے کی ضرورت ہے۔'' زاہد حسین کے چہرے پر تذبذب تھا۔ شاید اس کا ذہن بیک وقت دو تین جگہ چل رہا تھا۔ ''تمہارے دوست کو چاہیے کہ وہ میرٹ کو ترجیح دے۔'' زاہد حسین نے پتا پھینکا۔

''لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے۔'' میں نے چائے کی

چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''کیا مسئلہ؟''

''دراصل اس کے G.M پر بہت سے احسانات ہیں اور یہاں تک کہ......؟''

''یہاں تک کہ......کیا؟'' زاہد حسین کے ماتھ پر شکنیں اُبھر آئیں ......وہ ادھوری بات سے چڑ گیا۔

''یہاں تک کہ وہ اس فیکٹری کا G.M بھی اپنے اس دوست کی وجہ سے بنا تھا۔''

''اوہ...... یہ تو واقعی مسئلہ ہے۔'' زاہد حسین نے گہری سانس خارج کی۔

''بس اس وجہ سے ہی پریشان ہوں ......تم سے مشورہ لینے کی وجہ بھی یہی ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''اگر دیکھا جائے تو تمہارے دوست کو بات مان لینی چاہیے۔ لیکن ایک مسلمان ہونے حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا، تمہارے دوست کو چاہیے کہ وہ اپنے دوست کو قائل کرے اور حق تلفی ہرگز نہ کرے۔''

''وہی تو کررہا ہوں......'' میں نے بے اختیار کہا۔

''کیا؟'' زاہد حسین بری طرح چونکا۔

''قائل ......'' میں نے مطمئن لہجے میں آخری بازی چل دی۔

''اوہ......دھت تیری کی۔'' زاہد حسین کا یہ دوسرا اور آخری حیرت کا اظہار تھا۔ وہ ساری کہانی سمجھ گئے۔

''اس کا مطلب ہے وہ G.M (جنرل مینجر) تم ہو اور اس کا دوست میں ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر گردن جھکالی۔

جس طرح تم نے مجھے قائل کیا ہے...... اور جو تیکنیک استعمال کی ہے اس کو دیکھ کر مجھے یقین ہے، تمہارا فیصلہ بھی اسی طرح بہترین ہوگا۔ مجھے اب کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اور مجھے ایسا لگا کہ میرے سر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔

☆......☆......☆

علامہ اقبال اور ملازم

ایک روز اقبال نے دیکھا کہ پڑوسی کے ملازم نے ایک چوزا پکڑا اور اسے مڑوڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر آپ غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ اقبال کو اس حالت میں دیکھ کر ملازم وہاں سے بھاگ گیا۔ آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ اس ظالم آدمی کو پکڑ لاؤ۔ میں اسی طرح اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اس ننھی سی جان کو مسلتے ہوئے اس بزدل کا دل نہیں کانپا۔ بڑی دیر کے بعد آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا لیکن پھر بھی انتظار میں بیٹھے رہے کہ پڑوسی کا ملازم آئے تو اس کی خبر لیں۔ لیکن پھر معلوم ہوا کہ وہ ملازم اپنے انجام کے خوف سے ملازمت ہی چھوڑ کر بھاگ گیا۔

مرسلہ: عروبہ امتیاز خان

کوچۂ اشعار

جو بات کہو صاف ہو، ستھری ہو، بھلی ہو
کڑوی نہ ہو، کھٹی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو

شاعر: محمد اسمٰعیل میرٹھی، انتخاب: فہیم احمد

کرو عبادت سے دل منور سجا اپنا سجدے میں رکھو اکبر
خدا کا فضل و کرم تمہارا معین و ناصر اسی سے ہوگا

شاعر: اکبر الٰہ آبادی، انتخاب: حماد اکرم

عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تیری
جلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا!

شاعر: علامہ اقبالؔ، انتخاب: محمد بلال

گلستان جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گل کے جویا ہیں انہیں کیا خار کا کھٹکا

شاعر: محمد اسمٰعیل میرٹھی، انتخاب: زوہیب خان

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

شاعر: ساحر لدھیانوی، انتخاب: حفصہ ناصر

بام عروج پر اب انساں وہی ہیں مسٹر
جو چاٹتے ہیں جوتے یا مارتے ہیں جوتے

شاعر: راجہ مہدی علی خان، انتخاب: سعدیہ آفتاب

ظرافت خواہ مخواہ فن ہی نہیں ہے اک سعادت ہے
ہنسا کر غم کسی کا بانٹ لینا بھی عبادت ہے

شاعر: سعدیہ ملک، انتخاب: سید شاہد حسین

گرم ہوجاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہاں چار سو و رنگ و بو

شاعر: علامہ اقبال، انتخاب: رابعہ معین

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

شاعر: مرزا غالبؔ، انتخاب: اریشہ احمد

ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر شخص کہہ رہا ہے، زمانہ خراب ہے

شاعر: نیاز سواتی، انتخاب: محمد جنید احمد

زرافہ شاہی تحفہ

آج زرافہ سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ اگر آپ نے اسے جنگل میں نہیں دیکھا تو چڑیا گھر میں ضرور دیکھا ہوگا اور اگر وہاں بھی نہیں دیکھا تو کتاب میں تصویر تو دیکھی ہی ہوگی۔

لیکن گزشتہ صدی تک یہ بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ اس کو خیالی جانور تصور کرتے تھے اور ایک ایسی پراسرار قسم کی چیز سمجھتے تھے جو اونٹ اور چیتا کا مرکب ہو۔ البتہ اہل مصر اس سے ضرور واقف تھے کیونکہ ان کی مصوری اور تحریروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

جب جولیس سیزر نے قلوپطرہ کو ملکہ مصر بنایا تو وہ ایک زرافہ بھی اپنے ساتھ لے گیا اور اس طرح اہل یورپ نے پہلی دفعہ زرافہ دیکھا۔ یہ بات 46 قبل مسیح کی ہے۔ جب جلوس میں اس زرافہ کو پھرایا گیا۔

رومن اس جانور کی عزت کرتے تھے۔

رومن تہذیب کے زوال سے زرافہ بھی گمنامی کی دنیا میں کھو گیا البتہ کوس مجاس نامی سیاح کا پانچویں صدی میں ہندوستان سے گزر ہوا تو اس نے زرافہ شاہی دربار میں دیکھا۔

زمانہ وسطیٰ میں سلطان مصر اپنے پڑوسی عیسائی حکمرانوں کو تحفے کے طور پر زرافہ بجھواتے تھے۔ یہ بڑا قیمتی اور

انوکھا تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی میں ترک سلطنت کافی وسیع تھی۔ فرانس کے بادشاہ نے ایک سفارت ترک بھیجی۔ اس میں پیر بیلن بھی تھا جو کہ ماہر حیاتیات تھا۔ بیلن نے اس کو ایک خوبصورت اور بھیڑ کی طرح معصوم اور ایسا جانور قرار دیا جو جنگلی جانوروں میں سب سے زیادہ مستانہ رویہ رکھتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں جب یورپی اقوام نے افریقہ کی طرف توجہ دی تو پہلی دفعہ انہوں نے زرافہ قدرتی ماحول میں دیکھا اور یقین آیا کہ واقعی یہ خیالی چیز نہیں ہے لیکن مسلمان بادشاہوں نے اپنی تحفہ دینے کی روایت کو قائم رکھا اور محمد علی (والی مصر) نے فرانس کے بادشاہ چارلس دہم کو ایک دو سالہ مادہ زرافہ بڑی شان و شوکت سے بھیجی۔ دودھ پلانے کے لیے تین گائیں ساتھ تھیں۔ اس نے فرانس میں تہلکہ مچا دیا۔ اخباروں نے اس پر مضامین لکھے۔ سیاستدانوں نے اپنی تقاریر میں ذکر کیا۔ شعراء نے اس کے حسن کو اپنا موضوع بنایا اور پیرس کے فیشن ڈیزائنر نے زرافہ فیشن ایجاد کیا۔

اس کے بعد زرافہ یورپ کے چڑیا گھر میں عام ہو گیا لیکن اس بات کا سہرا لندن کے چڑیا گھر کے سر پر ہے کہ زرافہ نے پہلا بچہ وہاں پر دیا۔ یہ تو تھی زرافہ کی تاریخ۔ آیئے اب اس تاریخی جانور سے متعارف ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے وہ اس کا قد ہے اگرچہ ہاتھی وزن میں اس سے زیادہ ہے لیکن ہاتھی تقریباً دوٹن کا ہوتا ہے جب کہ زرافہ صرف ۲۸۰۰ پاؤنڈ تک ہوتا ہے کیونکہ اس کی گردن بہت لمبی ہے جس کی وجہ سے اس کا قد اٹھارہ فٹ تک ہوسکتا ہے۔

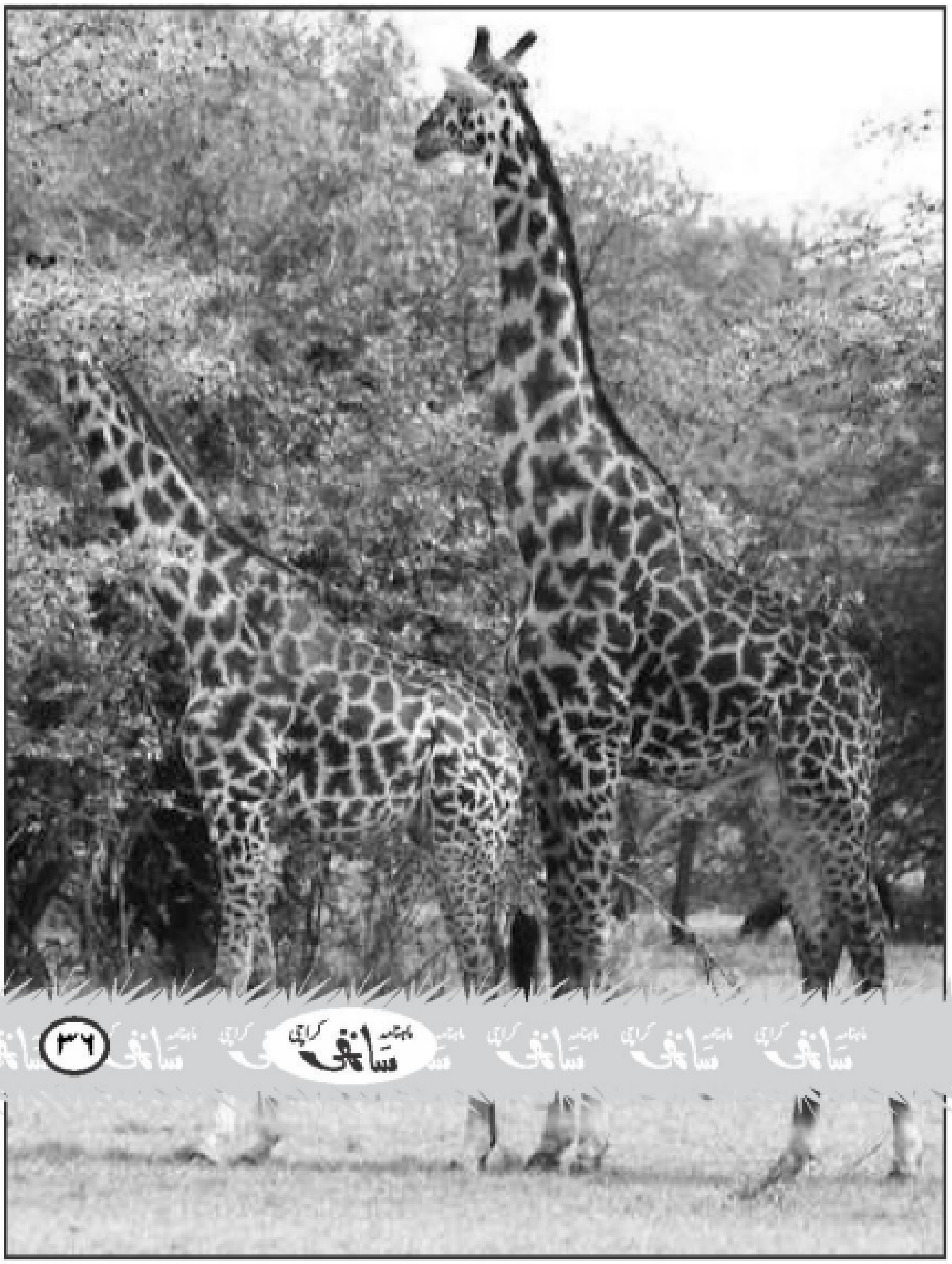

مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کی گردن میں بھی سات مہرے ہیں اور زرافہ کی گردن میں بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زرافہ کا ایک مہرہ ایک فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی اور گہرے بھورے رنگ کی ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ پلکیں گھنگریالی اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ کان ۹ انچ لمبے لیکن

ذرا پتلے ہوتے ہیں۔

زرافہ کے سینگ بھی ہوتے ہیں لیکن قد و قامت کے لحاظ سے تھوڑے مختصر۔ کھال ایک انچ موٹی ہوتی ہے اور بہت سخت۔ گردن پر گھوڑے کی طرح عیال بھی ہوتے ہیں۔ دُم تقریباً ڈھائی فٹ تک ہوتی ہے اور کھال پر چیتے کی طرح دھبے ہوتے ہیں۔

زرافہ کی نظر تیز ہوتی ہے اور یہ ایک کلومیٹر سے چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ آپ کی طرح رنگین ٹی وی بھی دیکھ سکتا ہے کیونکہ یہ رنگوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ زرافہ ایک انتہائی خاموش طبع جانور ہے آپ سال ہا سال اس کے ساتھ رہیں آپ اس کی آواز نہیں سنیں گے البتہ خطرے کے وقت ایک ہلکی سی ہنہنانے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ زرافہ میں قدرت نے اتنی لمبی گردن پر سر رکھا ہے خون سر تک لے جانا مشکل کام ہے۔ اس لیے اس کے لیے خصوصی والو ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات زرافے کی یہ ہے کہ اس کو پتے کی بیماری نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ اس کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔

آپ جنگل میں زرافہ دیکھیں تو پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے وہ قد و قامت ہے اس کے بعد چال۔ یہ ۲۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک بھاگ سکتا ہے۔ زرافہ کے لیے جھکنا یا لیٹنا مشکل کام ہے لیکن یہ ایسا کر ضرور سکتا ہے۔

زرافہ کی خوراک درختوں کے پتے، شاخیں اور ٹہنیاں ہیں۔ پھل اور بیج بھی کھاتا ہے، کیکر کا درخت اس کی خوراک میں پسندیدہ ہے، اس کو کیکر کے کانٹوں کی بھی پروا نہیں۔ ڈیڑھ انچ لمبے کانٹوں سمیت پتے اور شاخیں ایسے کھاتا ہے جیسے نرم حلوہ ہو۔

زرافہ گائے بیل کا بھائی بند ہے اور جگالی کرتا ہے۔ اونٹ کی طرح پانی پیے بغیر کافی عرصہ تک گزارہ کر سکتا ہے۔ یہ اکیلا رہتا ہے یا پھر ۲۰ سے ۳۰ تک کے گروہ میں جو کہ ایک ہی علاقے میں رہتے ہیں۔ زیادہ دور تک نہیں جاتے اور نہ ہی ہجرت کرتے ہیں۔

☆......☆

عبارت

ایک موچی نے پینٹر کو بورڈ لکھنے کے لیے یہ عبارت دی: ''یہاں پرانے جوتوں کی مرمت تسلی بخش کی جاتی ہے۔'' اور ایک گھی فروش نے بھی اسی پینٹر کو ایک بورڈ تیار کرنے کے لیے یہ عبارت لکھ کر دی: ''یہاں خالص دیسی گھی پچیس روپے کلو دستیاب ہے۔''

پینٹر نے جلدی میں بورڈ اس طرح لکھ دیئے:

''یہاں خالص دیسی جوتے پچیس روپے کلو دستیاب ہیں۔''

''یہاں پر دیسی گھی کی مرمت تسلی بخش کی جاتی ہے۔''

مرسلہ: فارعہ عبدالجبار، کراچی

☆......☆

ایئر کنڈیشنر

بچہ (ماں سے) ''امی ہمارے برابر والے گھر میں نئے پڑوسی آئے ہیں۔ ان کے گھر ایئر کنڈیشنر بھی ہے۔''

ماں ''ٹھیک ہے بیٹا ہم ان سے لیڈ لے لیں گے۔''

مرسلہ: سعد احمد، سکھر

☆......☆

عدم تحفظ

ایک ماں اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے کر

گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد ماہر نفسیات نے کہا
''بچے کی تحلیل نفس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کا شکار ہے۔''
ماں نے پریشان ہو کر کہا'' لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا محلہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔''

مرسلہ: شاہدہ متین، ملتان

☆......☆

اندازہ

ایک ماں اپنے شوہر کو بچے کی عادتوں کے بارے میں بتا رہی تھیں۔
''ہمارا بچہ بہت ذہین ہے۔ جب یہ چلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑا افسر چل رہا ہو۔ مطمئن اتنا ہے جیسے ملک کا وزیر اعظم ہو۔ باخبر اتنا ہے جیسے وزیر اطلاعات ونشریات ہو۔ سمجھدار اتنا ہے جیسے قائد حزب اختلاف ہو۔''
شوہر نے کہا: ''اندازہ لگا کر بتاؤ کہ یہ جیل میں کتنا عرصہ رہے گا۔''

مرسلہ: فہد قمر، لاہور

☆......☆

کیڑا

ایک شخص کے دانتوں میں کیڑا لگ گیا۔ وہ شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا ''ڈاکٹر صاحب! میرے دانتوں میں شدید درد ہے۔''
ڈاکٹر: ''تم تین روز تک مسلسل چائے، پاپے کھاؤ۔''
اس شخص نے دو روز تک چائے پاپے کھائے، تیسرے روز صرف چائے پی تو کیڑے نے باہر آ کر کہا'' آج پاپے نہیں ہیں کیا؟''

مرسلہ: نعمان حبیب، کراچی

☆......☆

ففٹی ففٹی

ایک کبابی مرغی کے کباب بیچا کرتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی عدالت میں گیا اور مقدمہ دائر کیا کہ کبابی مرغی کے خالص کباب نہیں بیچتا بلکہ اس میں گائے کے گوشت کی ملاوٹ کرتا ہے۔ جج نے کبابی کو بلا کر پوچھا تم کبابوں میں کتنی ملاوٹ کرتے ہو، تو کبابی نے جواب دیا کہ ففٹی ففٹی۔
جج نے پوچھا: ''ففٹی ففٹی سے کیا مراد ہے؟''
کبابی نے جواب دیا'' ففٹی ففٹی کا مطلب ہے کہ ایک گائے اور ایک مرغی۔''

مرسلہ: ناجیہ زیدی، کراچی

☆......☆

کولڈ ڈرنک

ایک دفعہ ایک بوڑھا جنگل میں جا رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک شیر آ گیا۔ شیر نے اس سے کہا
''آہاہاہا! میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''
بوڑھے نے جواب دیا'' میرا خون مت پیو۔ میرے پیچھے ایک جوان آدمی آ رہا ہے۔ اس کا خون گرم ہوگا۔ تم اس کا خون پی لینا۔''

انکل فِکری کے سائنسی تجربے

اس ماہ جانتے ہیں پانی کی چرخی کیسے بنتی ہے؟

پانی کی چرخی

پانی کی یہ چرخی بنائیں اور اس کو بہتے پانی کے نل کے نیچے رکھیں۔ جیسے جیسے پانی نکلتا رہے گا، یہ چرخی گھومتی رہے گی

آپ کو چاہیے: پلاسٹک کی خالی بوتل۔ پنسل۔ رسی کے ٹکڑے۔ قینچی

قینچی کی مدد سے بوتل کا اوپری حصہ اس طرح سے کاٹ لیں۔

پانی کے نل کے نیچے بوتل کو پکڑ کر نل کھول دیں۔ پانی جب بوتل میں بھر جائے گا تو نچلے سوراخ سے باہر کی جانب نکلے گا اور یوں پانی کی چرخی گھومتی رہے گی۔

بوتل کے پیندے کی طرف آٹھ سوراخ کرلیں۔
اب دو سوراخ بوتل کے اوپر کے حصے میں آمنے سامنے کرلیں۔

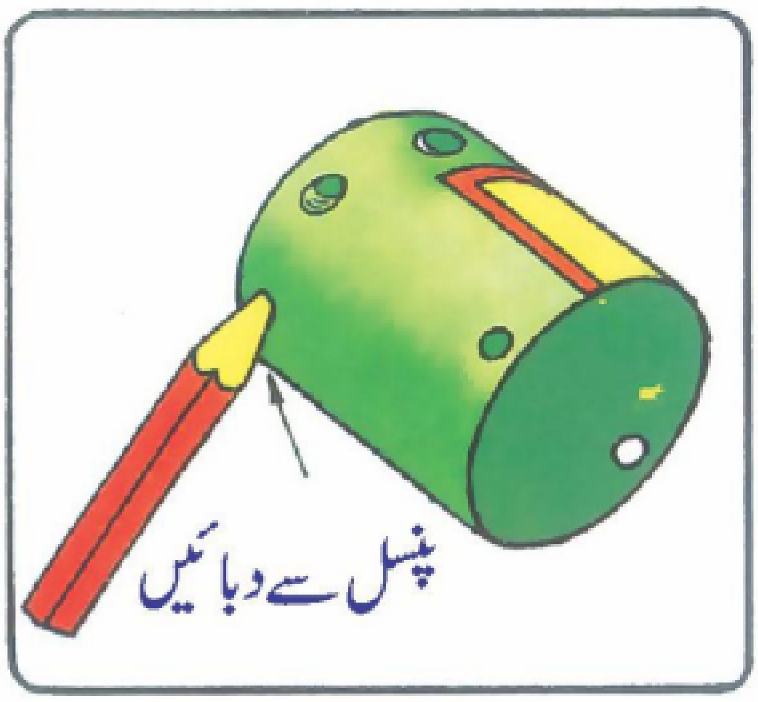

اب پنسل کی نوک کو نچلے آٹھ سوراخوں میں ڈال کر پنسل کو ایک طرف دبائیں۔اس طرح کہ سوراخ کا ایک حصہ ایک جانب دب جائے۔

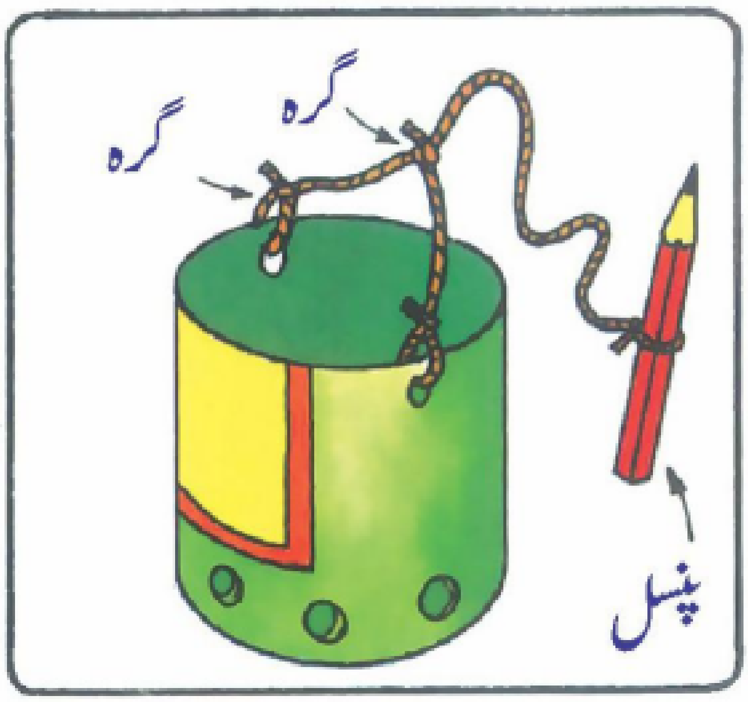

اب ایک رسی کے ایک ٹکڑے کو بوتل کے اوپری سوراخ سے باندھ دیں اور دوسری رسی پہلی رسی کے درمیان میں باندھ کر رسی پر پنسل باندھ دیں۔

جب پانی سوراخ کے کناروں سے ٹکرا کر خاص سمت سے باہر نکلتا ہے تو اس کا دباؤ بوتل کی دوسری سمت کی طرف پڑتا ہے اور بوتل مخالف سمت میں حرکت کرتی ہے۔

پھول سی تتلی

نعیم الدین نعیم

باغ میں بیٹھی پھول پہ تتلی خوشبو کے سنگ سیر کو نکلی
رنگ برنگی دلکش پیاری گل گلشن پر جائے واری
رنگ برنگی پر ہیں اس کے پاؤں میں چکر ہیں اس کے
لہراتی ہے اٹھلاتی ہے بچوں کا دل بہلاتی ہے
پیاری پیاری تتلی رانی پھلوں کی ہے یہ دیوانی
یہ نہ کسی کے دل کو دکھائے پرچم خوشیوں کا لہرائے
رنج و غم کی دھول اڑائے بھاگے دوڑے اور مسکائے
آگے پیچھے اڑنا اس کا دائیں بائیں مڑنا اس کا

بات نعیم ہے میٹھی سچی
تتلی رانی سب سے اچھی

شیر نے کہا ''نہیں! آج میرا کولڈ ڈرنک پینے کا موڈ ہے۔''

مرسلہ: فیصل عبدالصمد، سکھر

☆......☆

وقت

دو سہیلیاں آپس میں بیٹھی بڑے خوشگوار موڈ میں باتیں کررہی تھیں۔ ایک نے دوسری سے کہا

''کاش میں وقت ہوتی۔ دیکھونا بھئی تمام لوگ وقت کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ ہر کوئی وقت کا غلام ہوتا ہے اور وقت کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔''

''ہونہہ!'' دوسری سہیلی نے منہ بنا کر کہا ''اگر تم وقت ہوتیں تو لوگ تمہارے لیے اپنے گھروں کے دروازے بند کرلیتے۔''

''وہ کیوں بھئی؟'' پہلی سہیلی نے پوچھا۔

''لوگ کہتے کہ ہٹ جاؤ بھئی دیکھو کتنا برا وقت آرہا ہے۔''

مرسلہ: حیدر سعید، گجرانوالہ

☆......☆

نام

عبداللہ نامی ایک شخص شیخ سعدی سے ملنے پہنچا۔ اس کی آنکھ پر تل تھا۔ اتفاق سے شیخ سعدی گھر میں نہیں تھے۔ وہ شخص چلا گیا۔ بعد میں شیخ گھر آئے تو خادمہ نے بتایا۔

''حضور! ایک آدمی آپ سے ملنے آیا تھا۔''

شیخ نے پوچھا: ''اس کا نام کیا تھا؟''

خادمہ نے کہا: ''غبد اللہ۔''

شیخ بولے: ''غبد اللہ بھلا کیا نام ہوا؟''

''نام تو عبداللہ ہوتا ہے۔'' خادمہ نے جواب دیا۔

''مالک! آپ کی جان کی قسم! اس کی عین پر نقطہ تھا۔''

شیخ سعدی خادمہ کی نکتہ آفرینی سے بہت خوش ہوئے کیونکہ عین عربی میں ''آنکھ'' کو کہتے ہیں۔

مرسلہ: عادل رفیع، حیدرآباد

☆......☆

اشتہار

دو کاروباری حضرات آپس میں گفتگو کررہے تھے۔ ایک نے کہا ''تمہیں معلوم ہے کہ اشتہار دینے کا نتیجہ کتنی جلدی ظاہر ہوجاتا ہے۔''

''معلوم ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''پرسوں میں نے اخبار میں چوکیدار کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا اور کل ہمارے گھر چوری ہوگئی۔''

مرسلہ: فردوس ظفر، کراچی

☆......☆

آپ تو

ایک آدمی جب بھی کسی دوسرے سے ٹکراتا تو کہتا: ''گدھا کہیں کا......'' ایک مرتبہ وہ اپنے خیالوں میں گم گلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی ٹکر گدھے سے ہوگئی تو وہ جھینپ گیا لیکن پھر بولا: ''سر آپ کو کیا کہوں؟ آپ تو آپ ہی ہیں۔''

مرسلہ: فرید مشتاق، کراچی

☆......☆

بہروپیے

وقار محسن

''دیکھئے جناب آج ملک کے کونے کونے میں بے ایمانی، جھوٹ، مکر و فریب اور کرپشن کا کیسا جال پھیلا ہوا ہے۔''

ملک ستار صاحب اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے سامنے برتھ پر نیم دراز سیٹھ موتی والا سے مخاطب ہوئے۔

''جی ہاں ملک صاحب آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے خوف خدا تو بالکل اٹھ گیا ہے۔ ہر چیز میں ملاوٹ، ہر دفتر میں رشوت۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے تو طے کرلیا ہے کہ کینیڈا کی شہریت اختیار کرلوں۔''

سیٹھ موتی والا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی زنجیر گھماتے ہوئے جواب دیا اور ٹرین کی کھڑکی کے باہر پیچھے بھاگتے ٹیلی فون کے کھمبوں اور گھومتے ہوئے کھیتوں کے نظارے میں کھو گئے۔ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوکر فراٹے بھرتی ہوئی منزل کی طرف رواں

دواں تھی۔ ایک بوڑھی عورت اپنی بوسیدہ گٹھری گھسیٹتی ہوئی ملک ستار کی برتھ کے قریب رکی اور ان کی برتھ کے کونے پر ٹکنے کی کوشش کرنے لگی تو حاجی صاحب پیر مزید پسارتے ہوئے دہاڑے۔

"ارے کہاں گھسی آ رہی ہے۔ یہ پوری بوگی ریزرو ہے۔ چل آگے بڑھ۔"

کھڑکی کے نزدیک ایک نوجوان پھولدار شرٹ پہنے دونوں بزرگ صاحبان کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ بھی تبصروں میں شامل ہو گیا۔

"جناب میرا تو خیال ہے کہ اب ملک کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ ہی انقلاب لا سکتے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام ناقص ہے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے نوجوانوں میں مایوسی اور بے چینی پھیل رہی ہے، اگر مجھے موقع ملے تو میں ملک کی تقدیر بدل دوں۔ ابھی نوجوان مزید تقریر کرنے کے موڈ میں تھا کہ اسٹیشن آ گیا اور لوگ پلیٹ فارم کی رونقوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم سے روانہ ہوئی۔ ایک ٹی ٹی صاحب میلی سی وردی میں ملبوس اپنی منکا سی توند سہلاتے ہوئے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ ٹی ٹی کی جھلک دیکھتے ہی ملک صاحب اپنی چادر لے کر اوپر کی برتھ پر دراز ہو کر خراٹے لینے لگ گئے جیسے گہری نیند میں ہوں۔ سیٹھ موتی والا کو بھی اچانک پیٹ میں اپھار محسوس ہوا اور وہ لوٹا لے کر مختلف سمت کے باتھ روم کی طرف لپک گئے۔ پھولدار شرٹ والا انقلابی نوجوان بھی اپنا تھیلا اٹھا کر دوسرے کمپارٹمنٹ کی طرف کھسک گیا۔ کچھ دیر بعد ٹی ٹی صاحب باچھوں سے پان کی پیک صاف کرتے ہوئے اس کیبن کی طرف آئے۔ وہ ہر مسافر کا ٹکٹ دیکھنے کے بعد ایک ماہر سراغرساں کی طرح مسافر کے چہرے کو غور سے دیکھتے اور پھر ہونٹ پچکا کر آگے بڑھ جاتے۔ اوپر کی برتھ پر خراٹوں کی نشریات سن کر ٹی ٹی صاحب نے ملک صاحب کا شانہ ہلا کر کرخت آواز میں کہا۔

"ٹکٹ پلیز!"

"ارے صاحب! سونے دیں۔ نیک بزرگ ہیں۔ بغیر ٹکٹ تو سفر نہیں کر سکتے۔" سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک مسافر نے کہا۔

"قبلہ! آپ مجھے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے دیں۔ ہم تنخواہ کس بات کی لیتے ہیں۔ آخر فرض شناسی بھی کوئی چیز ہے۔" ٹی ٹی نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا اور پھر ملک صاحب کا شانہ ہلایا۔

"جناب جلدی کریں۔ مجھے پوری ٹرین دیکھنی ہے۔"

ملک صاحب بادل ناخواستہ اٹھے اور اپنی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولنا شروع کیں۔

"کیوں صاحب! یقیناً ٹکٹ کہیں گر گیا ہوگا۔ رہنے دیں یہ ڈرامے ہم روز دیکھتے ہیں۔" ٹی ٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔

ملک صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لوگ ان کو چبھتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' ٹی ٹی نے ڈپٹ کر پوچھا۔
''جی لاہور......'' ملک صاحب نے سر جھکا کر کہا۔
''ویسے تو آپ کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا لیکن آپ کی عمر کا خیال کر کے چھوڑ دیتا ہوں۔ لایئے 1950 روپے ٹکٹ بنادوں۔''
''جی میرے پاس تو صرف چھ سو روپے ہیں۔'' ملک صاحب نے آہستہ سے کہا۔
''کیا کہا؟ چھ سو روپے؟ تو کیا باقی میں اپنی جیب سے دوں گا۔ میری جگہ اور کوئی ہوتا تو شاید آپ سے رشوت لے کر چھوڑ دیتا لیکن میں ایک فرض شناس افسر ہوں۔ جلدی رقم نکالیں۔''
ملک صاحب کی حالت دیکھ کر کچھ لوگوں کو رحم آیا اور سب نے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کر کے ٹکٹ کی پوری رقم ٹی ٹی کے حوالے کر دی۔ ٹی ٹی نے برتھ کے کونے پر بیٹھ کر ٹکٹ بنایا اور رسید ملک صاحب کو دیتے ہوئے بولا۔
''آئندہ خیال رکھیں۔ ہم جب تک اپنے اپنے فرائض ایمانداری سے ادا نہیں کریں گے وطن عزیز کی حالت یونہی خراب رہے گی۔'' کوئی اسٹیشن آنے والا تھا اس لیے ٹی ٹی دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ کہہ رہے تھے۔
''دیکھئے صاحب ریلوے میں کیسے کیسے ایماندار اور فرض شناس ہیں۔''
اگلے اسٹیشن پر ٹرین کچھ دیر رک کر جب روانہ ہوئی تو ایک اور ٹی ٹی اسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور لوگوں کے ٹکٹ چیک کرنا شروع کر دیئے۔ مسافروں میں سے ایک صاحب نے ناراضگی سے ٹی ٹی کو مخاطب کیا۔
''جناب آپ لوگوں نے کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ ابھی ایک صاحب ٹکٹ چیک کر کے گئے ہیں اور اب آپ آدھمکے۔''
''کیا فرمایا آپ نے؟ کون ٹکٹ چیک کر کے گیا ہے؟ اس ٹرین پر تو میرے علاوہ کوئی ٹی ٹی نہیں ہے۔'' ٹی ٹی نے تعجب سے کہا۔
''ارے صاحب آپ کمال کرتے ہیں۔ اس ٹی ٹی نے ان صاحب کو ابھی ٹکٹ بھی بنا کر دیا ہے۔''
ملک صاحب نے ہڑبڑا کر وہ ٹکٹ ٹی ٹی صاحب کے حوالے کیا۔ ٹی ٹی نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔
''ارے بھئی یہ ٹکٹ اور وہ ٹی ٹی دونوں جعلی ہیں۔ کوئی بہروپیا آپ سے رقم لے اڑا۔ لائیں دوسرا ٹکٹ بنوائیں۔''
لوگ ٹی ٹی کے گرد جمع ہو کر ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ٹرین طوفانی رفتار سے منزل کی طرف رواں دواں تھی اور ان ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سوچ رہے تھے کہ وہ جعلی ٹی ٹی ایمانداری کے نام پر دھوکہ نہ دیتا اگر ملک صاحب جیسے مسافر ٹرین میں نہ ہوتے۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے جیسے کو تیسا۔

☆......☆

کوئی نہ کرنا کام اُدھورا

شامؔ درانی

لکھو، پڑھو آرام کرو
وقت پہ سارے کام کرو
جو بھی وقت گنواتا ہے
اک دن وہ پچھتاتا ہے
سورج، چاند، ستارے بھی
کرتے ہیں وقت کی پابندی
کھاؤ نہ چغلی، جھوٹ نہ بولو
جو کچھ بولو پہلے تولو
اچھے اِک انسان بنو تم
کس نے کہا شیطان بنو تم
کوئی نہ کرنا کام ادھورا
کام ہو جو بھی کرنا پورا
جو نہ کرے گا مار پٹائی
کھائے گا وہ دودھ ملائی

اب تو بتا دیجئے

انعامی سلسلہ نمبر 35

ساتھیو! آپ کے لیے ساتھی لایا ایک زبردست انعامی سلسلہ ''اب تو بتا دیجئے'' جس میں ہم دیں گے آپ کو اشارے اور آپ کو پہچاننے ہوں گے ان کے نام......!!

اور ہاں......اگر آپ نے تمام اشاروں کے درست نام ہمیں بھیجے تو آپ کو ملے گا انعام وہ بھی آپ کی مرضی کا......!!

۱

ایشیاء کا ایک اسلامی ملک جس کے شمال میں ترکی، مشرق میں عراق، جنوب میں اردن اور مغرب میں بحیرہ روم ہے۔ دارالحکومت کا نام دمشق ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان عربی ہے۔
(شام، ایران، لبنان)

(ملک کا نام بتائیں)

۲

ایک پرندہ، قد عموماً چھ سے آٹھ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ پیر میں صرف دو انگلیاں ہوتی ہیں۔ گھاس اور کیڑے مکوڑے کھاتا ہے، کئی دنوں تک بغیر پانی کے زندہ رہتا ہے چوں کہ بہت تیز دوڑ سکتا ہے لہٰذا اسے دوڑ کے مقابلوں میں شریک کیا جاتا ہے۔ (شترمرغ، مور، کیوی)

(پرندے کا نام بتائیں)

۳

ضلع گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ جنگ ستمبر 1965ء میں چھمب جوڑیاں محاذ پر داد شجاعت دے کر ستارہ جرأت حاصل کیا۔ 1967ء میں میجر کے عہدے پر ترقی ملی۔ 6 دسمبر 1971ء کی سہ پہر کو وطن عزیز کا دفاع کرتے ہوئے شہادت پائی۔ جنوری 1972ء میں آپ کو ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز نشان حیدر دیا گیا۔
(میجر شبیر شریف، میجر راجہ عزیز بھٹی، کیپٹن طفیل محمد)

(شخصیت کا نام بتائیں)

۴ آلو کی قسم کی ایک سبزی جو نرم اور ریتیلی زمین میں اگتی ہے۔ ان کی کاشت پہاڑوں پر ناممکن ہے۔ دو اقسام مقبول ہیں۔ ایک سرخ اور دوسری سفید۔ ذائقہ میں میٹھی ہوتی ہیں۔ نشاستہ سے بھرپور ہوتی ہیں۔ عموماً بھون کر، ابال کر یا پھر اس کی کھیر پکائی جاتی ہے۔
(اروی، شکر قندی، شلجم)

(سبزی کا نام بتائیں)

۵ انگریز ڈراما نگار اور شاعر، پرانی کہانیوں سے تھیٹر کے لیے ڈرامے تیار کرتا تھا۔ سال میں دو نئے ڈرامے لکھنا اس کا معمول تھا۔ اس کے مشہور ڈرامے ہیملٹ، جولیس سیزر، اوتھیلو، رومیو اور جولیٹ اس کے مشہور ڈراموں میں سے ہیں۔ (شیکسپیئر، آرتھر کونان ڈائل، فرینکلن)

(ادیب کا نام بتائیں)

کوپن ''اب تو بتا دیجیے'' (35)

نام ____________

کلاس ____________ فون ____________

پتہ ____________

ای میل ____________

اپنی مرضی کا کوئی ایک انعام منتخب کریں

☐ ساتھی کی سالانہ ممبر شپ ☐ مصوری کا سامان

☐ ۵۰۰ سو روپے کی لائبریری ☐ اسٹیشنری کا سیٹ

ہدایات

☆ ...... پچھلے صفحہ پر دیئے گئے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆ ...... انعام پر خوب سوچ سمجھ کر نشان لگائیے گا۔(لیکن صرف ایک پر)

☆ ...... نیچے دیئے گئے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆ ...... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کریں۔

☆ ...... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆ ...... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتہ: F-206 سلیم ایونیو، بلاک 13-B گلشن اقبال، کراچی۔فون:021-4976468

ای میل:monthlysathee@hotmail.com

جوابات

١ ______________________

٢ ______________________

٣ ______________________

٤ ______________________

٥ ______________________

اب تو بتادیجئے 33

صحیح جوابات

۱۔ یاقوت

۲۔ یاک

۳۔ حضرت یونسؑ

۴۔ آستانہ

۵۔ نائٹروجن

انعامات حاصل کرنے والے ساتھی

☆......محمد فہد اظہر (بہاولپور)	ساتھی کی سالانہ ممبر شپ
☆......حافظہ مریم ریاض ارشد (کراچی)	اسٹیشنری کا سیٹ
☆......آمنہ شفیق (کراچی)	ساتھی کی سالانہ ممبر شپ
☆......حرا حسین (حیدرآباد)	ساتھی کی سالانہ ممبر شپ
☆......آمنہ بنت مدبر (کراچی)	۵۰۰ روپے کی لائبریری

تمام صحیح جوابات دینے والے ساتھی

خوش بخت (کراچی)، محمد فہد اظہر (بہاولپور)، امین مقبول (کراچی)، آمنہ بنت مدبر (کراچی)، مریم ریاض ارشد (کراچی)، عائشہ خان (کراچی)، سید خزیمہ احمد (کراچی)، سلمان شاہد (کراچی) زوبینہ یمین (کراچی)، آمنہ شفیق (کراچی)، حسن شفیق (کراچی)، صبا رفیق (کراچی)، سعیہ شفیق (کراچی)، حرا حسین (حیدرآباد)، اریبہ جاوید (کراچی)، عمار جاوید (کراچی)، خضر حیات (کراچی)، نوفل صلاح الدین (کراچی)۔

۵ سے کم درست جوابات دینے والے ساتھی

آمنہ عبدالجبار (کراچی)، اسامہ الیاس (کراچی)، محمد ایوب (کوٹری)، عروبہ امتیاز خان (کراچی)، راشد وفالھڑی (ڈیرہ مراد جمالی)، اظہر احمد (نصیر آباد)، عبیداللہ مینگل (ڈیرہ مراد جمالی)، غلام مرتضیٰ (بلوچستان)، اسامہ حبیب (ہیڈراجکاں)، محمد ناصر (بلوچستان)، خادم حسین (نصیر آباد)، سید معبد حیدر (کراچی)، مرید حسین (بہاولپور)، سید محمد مصعب (کراچی)، محمد سلیمان (بلوچستان)، عبیداللہ (ڈیرہ مراد جمالی)، محمد اذان (کراچی)، بلال احمد بنگلوئی (نصیر آباد)، سعود حماد ذیری (کراچی)، شیروز خان (بلوچستان)، طوبیٰ جاوید اقبال (کراچی)، شائق خان (ڈیرہ مراد جمالی)، امیر حمزہ (ڈیرہ مراد جمالی)، گل شیر خان (بلوچستان)، سید محمد مصعب (کراچی)، آمنہ توفیق (لاہور)، حامد بن عتیق (سیالکوٹ)، اقراء صدیق (کراچی)، سید تحریم فاطمہ (کراچی)، محمد ابراہیم بلال (نصیر آباد)، سمیعہ کنول (کراچی)، عرض محمد (بلوچستان)، عفرا اعجاز (کوئٹہ)، جویریہ یوسف (کراچی)، بسمہ سلیم (جدہ)، عمارہ حسین (تبوک)، ماریہ احمد (جدہ)، مرسلین بن ارسلان (ریاض)، عاقب تنویر (بہاولپور)، اویس احمد (بلوچستان)، شیر یار علی (ہری پور)، جبال سردار بیگ (حیدرآباد)، سید ضاحقہ (کراچی)، عبدالمتین زیدی (نصیر آباد)، عبدالستار ابگٹی (نصیر آباد)، معین خان (کوٹری)، ارشد حبیب (کوٹری)، فرقان امین (جمشید روڈ)، عدنان مجید (لیاری)، محمد علی بیگ (کراچی)، نگینہ امیر (ملیر) محمد عمیس (سکھر)، محمد وفالہڑی (ڈیرہ مراد جمالی)، مصدق احمد قندیاری (ملیر)، ارشاد وفالہڑی (ڈیرہ مراد جمالی)، سرفراز حسین (محمود آباد)، عفرا قیصر (کراچی)، مظہر (سکھر)، افروز ایمان (اسلام آباد)، حافظ بلال بٹ (اسلام آباد)، حافظ تیمور بٹ (اسلام آباد)، خبیب حبیب اللہ (راولپنڈی)، شایان سلیم (حیدرآباد)، آغا انوار سہیل (میرپور خاص)، میر مرتضیٰ صبور (ٹنڈو آدم)، محمد بلال صدیقی (کراچی)، عمار یعقوب (اٹک)، ثوبان وسیم (اسلام آباد)، شارق جہانزیب (صادق آباد)، فیضان مرتضیٰ (کوئٹہ) عنبرین سلطانہ (لاہور)، فاطمہ علی (ریاض)، صہیب فاروقی (جدہ)، عائشہ نعیم صدیقی (ریاض)، ثمرین ناصر (شارجہ)۔

☆......☆

فرق تلاش کریں

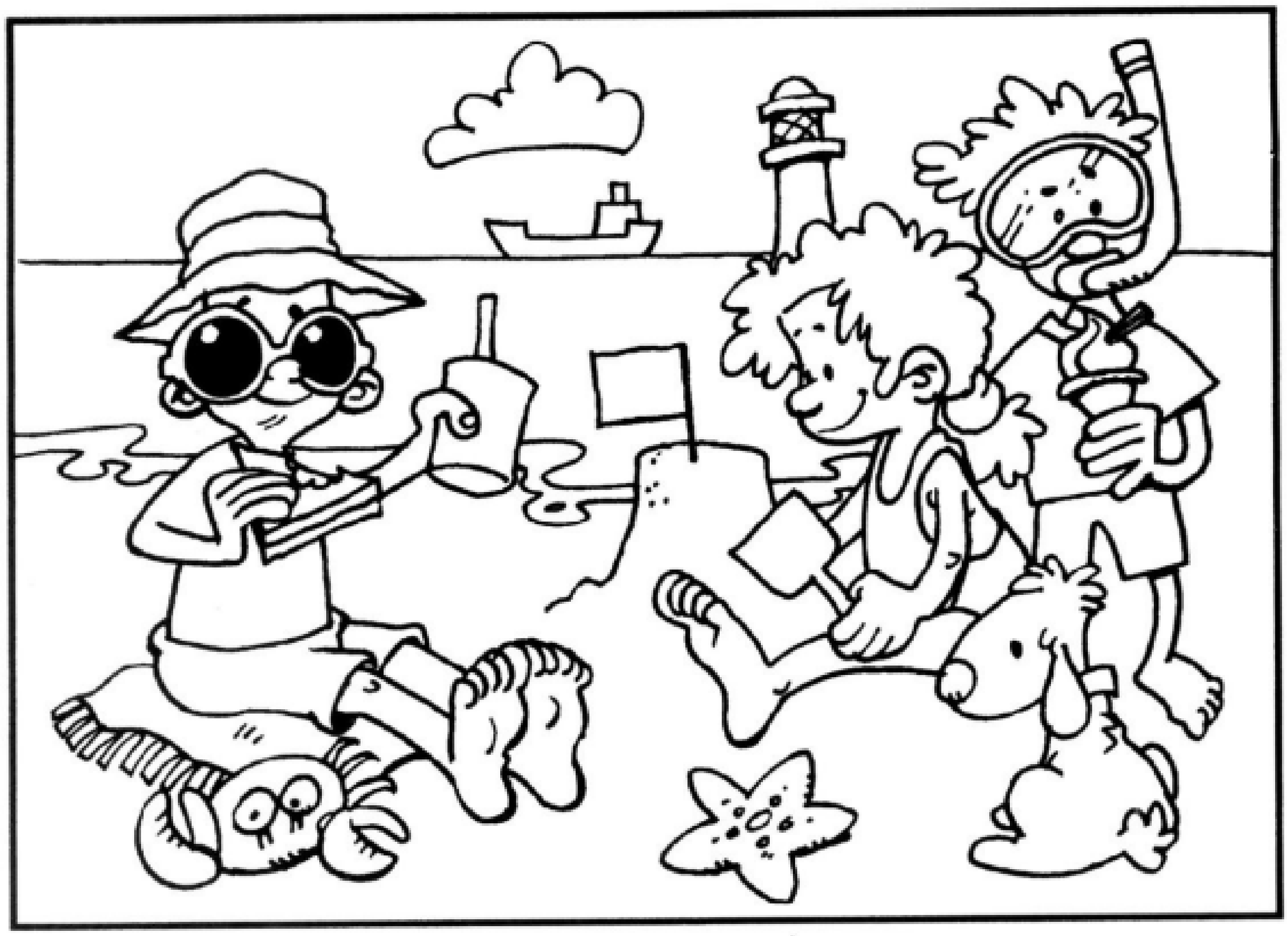

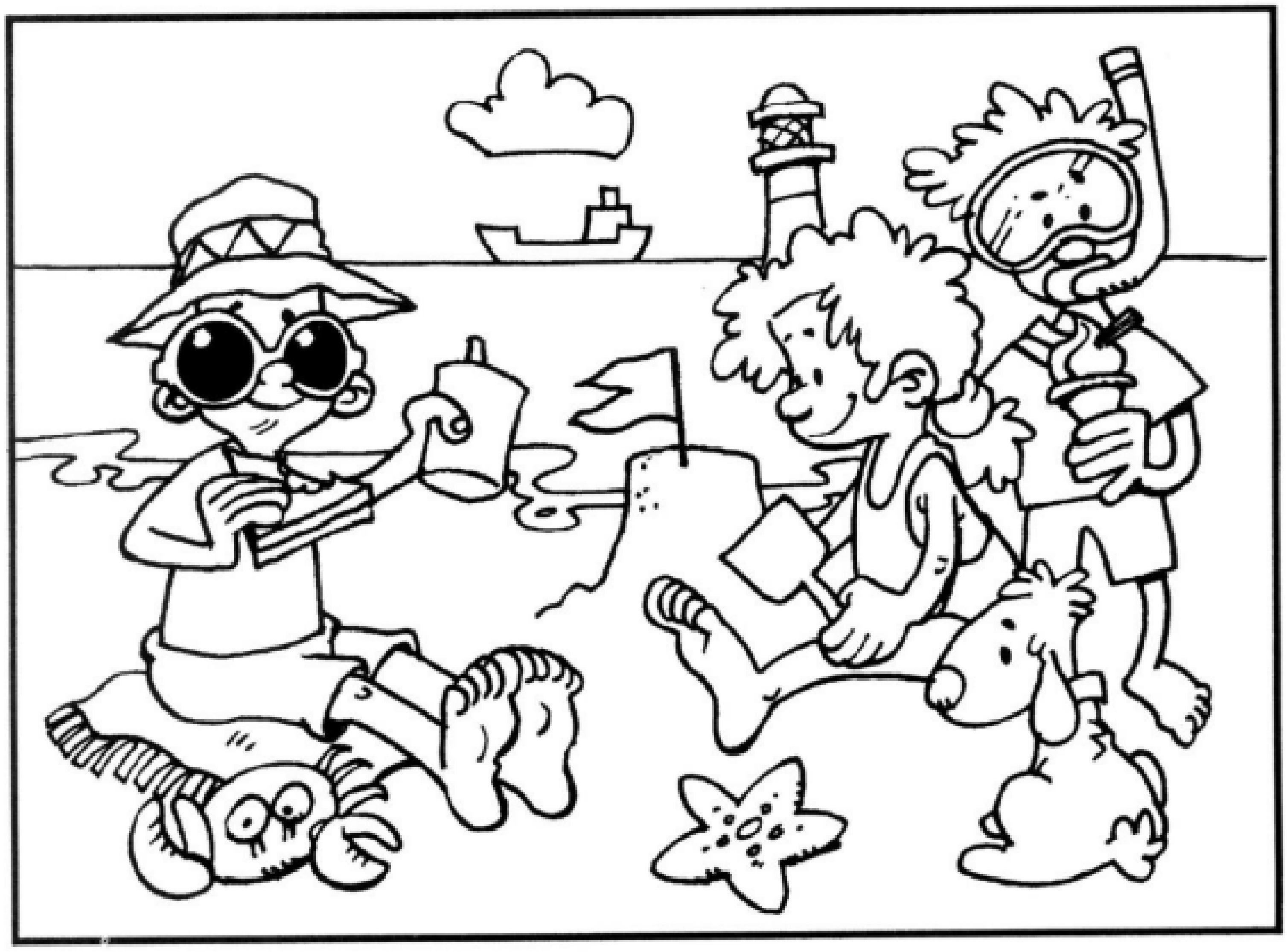

بُرے پھنسے

ڈاکٹر عمران مشتاق۔ یو کے

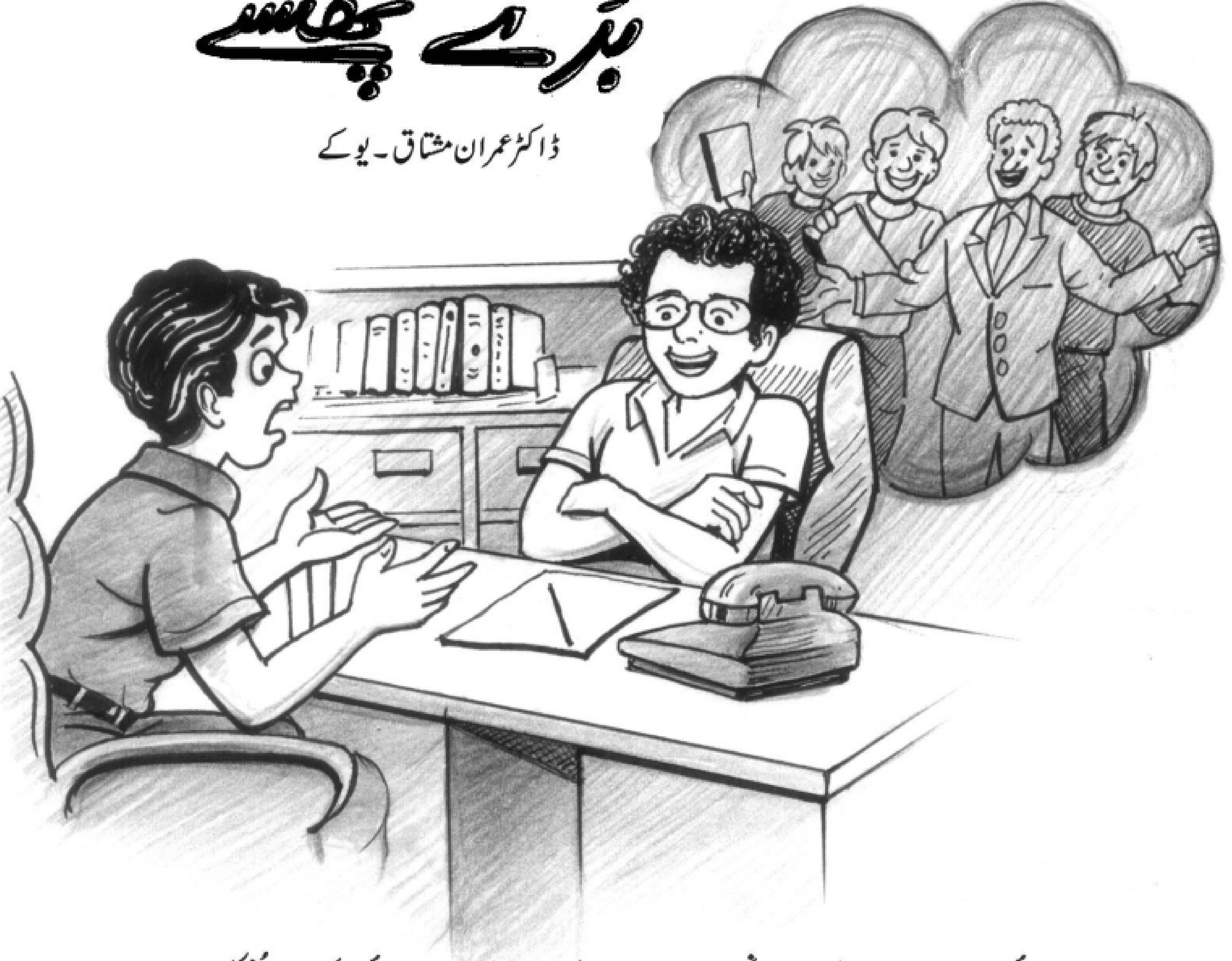

رئیس جب برطانیہ کے شہر مانچسٹر آیا تو اُس کی عُمر صِرف تین سال تھی۔اب وہ گیارہ سال کا تھا اور مانچسٹر گرامر اسکول میں ائیر سیون (ساتویں جماعت) میں پڑھتا تھا، جو کہ علاقے کا سب سے بہترین اسکول تھا اور مقابلے کے امتحان کو پاس کرنے کے بعد اُس میں داخلہ ملتا تھا۔رئیس کے ابو کا اپنا کاروبار تھا اور وہ خاصی سہولت سے زندگی گزار رہے تھے۔سب کچھ اچھا چل رہا تھا کہ اچانک رئیس کو ایک مُشکل نے آ گھیرا۔وہ بے حد لائق اور محنتی طالب علم تھا۔دو انگریز بچے آرتھر اور بوب اُس سے جلنے لگے اور موقع کی تلاش میں رہنے لگے تاکہ اُسے نقصان پہنچا سکیں۔ویسے تو وہ دونوں بھی لائق تھے مگر اب تک کے ٹیسٹوں میں اُن کے نمبرز رئیس سے کم آئے تھے۔اِس بات کا اُنہیں بڑا صدمہ تھا کہ ایک پاکستانی لڑکا اُن سے آگے کیسے نِکل

گیا۔ اُنہیں جب بھی موقع ملتا تو اُس کو مذاق کا نشانہ بناتے۔ اُس پہ آوازیں کستے اور تضحیک آمیز جُملوں سے اُسے تکلیف پہنچاتے۔ رئیس بڑی بہادری سے اِن حالات کا مقابلہ کر رہا تھا اور اُس نے اب تک اپنے والدین کو اِس بات کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ایک دِن عجیب واقعہ پیش آیا۔

سائنس کا ٹیسٹ ہو رہا تھا۔ سائنس کے ٹیچر جیکسن مائر طبعیت کے سخت تھے اور اُن سے سارے لڑکے ڈرتے تھے۔ سارے لڑکے سوال حل کرنے میں مصروف تھے۔ وہ گھوم پھر کر کلاس کا چکر لگا رہے تھے۔ چکر کے دوران وہ اچانک زمین پہ جُھکے اور انہوں نے کوئی چیز اُٹھائی۔ وہ مُڑا تُڑا کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ آرتھر نے انہیں کاغذ اُٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مائر صاحب نے اُس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

آرتھر فوراً بول پڑا۔ ''سر! یہ کاغذ کا ٹکڑا میں نے رئیس کو زمین پہ گراتے ہوئے دیکھا تھا۔''

بوب نے بھی آرتھر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''آرتھر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاید رئیس کو سوالات کے جوابات نہیں آتے اِس لیے نقل کر رہا ہوگا۔''

مائر صاحب نے بوب کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں اِس بات کا کیوں یقین ہے کہ رئیس نقل کر رہا تھا؟''

بوب نے قصداً جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''سر! میں نے پہلے بھی اُسے نقل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور سمجھایا بھی ہے کہ ایسا نہ کرو۔''

آرتھر نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔ کہنے لگا۔ ''سر! میں نے بھی سمجھایا تھا مگر رئیس نہیں مانا۔ اُسے تو بس اُلٹے سیدھے طریقے سے سب سے زیادہ نمبر لینے کا شوق ہے۔''

مائر صاحب نے کاغذ کی سلوٹیں درست کیں اور پھر اُس پہ لکھی ہوئی تحریر دِل ہی دِل میں پڑھنے لگے۔ رئیس بیچارہ اِس ساری صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ اُسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اُس نے آرتھر اور بوب کے چہرے پہ اپنے لیے حقارت کے آثار دیکھ لیے تھے۔ اُسے دال میں کالا لگ رہا تھا مگر کیا؟

مائر صاحب نے کاغذ کو دوبارہ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر وہ رئیس کی طرف دیکھنے لگے۔

رئیس گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ ''سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو ٹیسٹ میں اتنا مصروف تھا کہ مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے؟'' رئیس گھبرایا ہوا ضرور تھا مگر اُس کے لہجے میں کوئی کمزوری نہیں تھی۔

''چلو تُم اپنا ٹیسٹ مکمل کرو اور تُم دونوں بھی۔'' پہلے اُنہوں نے رئیس کو تاکید کی اور پھر آرتھر اور بوب کو اپنی سیٹوں پہ بیٹھنے کے لیے کہا۔

آرتھر اور بوب دونوں نے مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ دونوں کی ملی بھگت تھی۔ بوب نے موقع پاتے ہی وہ کاغذ کا ٹکڑا رئیس کی ڈیسک کے پاس پھینکا تھا۔ وہ تو رئیس کو ''رنگے ہاتھوں'' پکڑوانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ٹیسٹ کے اختتام پر مائر صاحب نے رئیس کو اپنے دفتر میں آنے کے لیے کہا تو رئیس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آرتھر اور بوب کے چہرے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رئیس اب بُری طرح پھنس چکا ہے۔

☆......☆

رئیس کلاس میں واپس آیا تو اُس کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مُشکل تھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا؟ بوب اور آرتھر کا تجسس کے مارے بُرا حال تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ رئیس سے تفصیل پوچھیں کہ مائر صاحب کی طرف سے اُن کے لیے بلاوہ آ گیا۔ دونوں مائر صاحب کے کمرے میں پہنچے تو اُن کے دِل دھک دھک کر رہے تھے۔

مائر صاحب نے گہری نظر سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تُم دونوں نے ایسا کیوں کیا؟''

آرتھر نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ''سس۔۔۔ سر۔۔۔۔ ہم نے تو کُچھ نہیں کیا۔''

وہ بوب کی جانب مُڑے۔ ''اور تُم۔۔۔؟''

بوب کی حالت اِس سوال جواب سے بُری ہو رہی تھی۔ کہنے لگا۔ ''سر رئیس نے نقل کی ہے۔ آپ اُسے سزا دیں۔''

مائر صاحب نے اُسے گھورتے ہوئے سخت لہجہ اختیار کیا۔ ''فضول باتیں نہ کرو اور نہ ہی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرو۔ میں نے تمھیں خود وہ کاغذ پھینکتے ہوئے دیکھا تھا۔'' مائر صاحب نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔

بوب اُن کے چکر میں نہیں آیا بلکہ اُس نے صاف مکرتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں سر میں نے نہیں پھینکا تھا۔''

مائر صاحب نے دونوں کو وارننگ دی۔ ''کل میں تُم دونوں کے والدین کو بُلا رہا ہوں۔ یہ سیریس معاملہ ہے۔'' اُنہیں رئیس نے یہ بات بتا دِی تھی کہ دونوں اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اگلے دِن دونوں کے والدین اسکول آئے اور مائر صاحب نے انہیں ساری بات بتا دِی۔ بوب اور آرتھر کے والدین یہ سُن کر بے حد شرمندہ ہوئے۔ مائر صاحب نے اُنہیں بتایا کہ ''دونوں رئیس سے جلتے تھے اور اُسے پھنسوانا چاہتے تھے لیکن اُس کی بجائے دونوں خود ہی بُرے پھنسے۔ بوب نے ایک کاغذ پر کئی سوالوں کے جواب لکھ کر وہ کاغذ رئیس کے قریب اِس اُمید پہ پھینک دیا تھا کہ وہ نقل کرتے ہوئے پکڑا جائے

گا۔ بوب سے غلطی یہ ہوئی کہ ٹیسٹ سائنس کا تھا اور جو کاغذ اُس نے پھینکا اُس پہ ریاضی کے سوالات لکھے ہوئے تھے۔''

بوب نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اِس بات کا اعتراف کیا کہ ''اُس نے آرتھر کے ساتھ مِل کر ریاضی اور سائنس دونوں کے ٹیسٹ کے لیے مواد تیار کیا تھا۔ اگر سائنس کے ٹیسٹ میں کامیابی نہ ہوتی تو پھر ریاضی کے ٹیسٹ میں کوشش کی جاتی۔ غلطی سے سائنس کے ٹیسٹ میں اُس نے جیب سے ریاضی والا کاغذ نکالا اور دیکھے بناء ہی پھینک دیا تھا۔''

مائر صاحب نے دونوں کو سخت سرزنش کرتے ہوئے، رئیس سے معافی مانگنے کی تلقین کی ورنہ سزا تو لازمی تھی۔ دونوں نے رئیس سے معافی مانگی۔ اُس نے فراخ دلی سے دونوں کو معاف کر دیا۔ آج تینوں بہترین دوست ہیں اور اُن کی دوستی کی مثال دِی جاتی ہے۔

☆......☆

کامیابی کے اصول

☆ آپ کھیل کود، سونے جاگنے، پڑھنے، کھانے پینے اور دوسرے کاموں کے اوقات مقرر کریں جیسے کہ کھیل کے وقت کھیلیں اور دوسرے کاموں کے وقت میں جو کام کرنا ہے وہ کریں۔

☆ صرف امتحان کے دنوں میں پڑھنے کے بجائے روزانہ وقت مقرر کر کے پڑھائی کریں۔

☆ آپ جس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں اسے دلچسپی سے سمجھیں کہ مضمون میں کیا بات کہی جا رہی ہے۔ اس کے بعد مضمون کو اپنی لکھائی میں لکھ کر سمجھیں۔ اس طرح سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور آپ جو کچھ پڑھیں گے وہ ذہن نشین ہو جائے گا۔

☆ وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے کیونکہ وقت ہی سب کچھ ہے اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہر وقت ایک جیسا نہیں ہوتا۔

☆ ہر حال میں نماز کی پابندی کریں اور صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔

مرسلہ: عظمیٰ آفرین، کراچی

اگر دل لگاؤ گے محنت کرو گے — تو خوشیوں سے تم اپنا دامن بھرو گے
اگر شوق سے علم حاصل کرو گے — تو ہر روز آگے ہی آگے بڑھو گے
خدا تم سے خوش ہوگا جنت ملے گی — جو ماں باپ کی خوب خدمت کرو گے
جو عزت ہوئی تم سے چھوٹے بڑوں کی — تو اعمال میں اپنے موتی جڑو گے
کرو گے اگر تم نہ غیبت کسی کی — خدا کی قسم اونچے زینے چڑھو گے
غرور اور تکبر اگر دل میں رکھا — زمیں پر بلندی سے تم آپڑو گے
بلند مرتبہ پاؤ گے ایک دن تم — جو اپنائے اچھوں کی سیرت رہو گے
جگہ تم کو جنت میں اعلیٰ ملے گی — جو کفار سے لڑتے لڑتے مرو گے

افق راہ پا جائیں گے خود ہی بچے
کہاں تک انہیں پند کرتے رہو گے

موت کا راستہ

اشتیاق احمد

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید ایک بار پھر وطن عزیز کی سلامتی کے لیے سرگرم عمل!!

پچھلی اقساط کا خلاصہ:

بیگم عرفان اپنے کمرے میں سو رہی تھیں کہ ایک آدمی ان کے کمرے میں گھس آیا اور اطمینان سے الماری میں چند کاغذات تلاش کرنے لگا۔ بیگم عرفان کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اتنے میں دروازے کی بیل بجی اور عرفان صاحب اپنے بچوں کے ہمراہ آگئے۔ عرفان صاحب کے پیچھے پولیس آگئی جو کسی ملزم کی تلاش میں تھی۔ گھر کی تلاشی لینے کے بعد آدمی جو چھپ گیا تھا، اپنے ساتھیوں سمیت باہر آیا۔ جس نے عرفان صاحب اور ان کے گھر والوں کو مجبوس کر کے محکمہ داخلہ کی اہم فائل کا مطالبہ کیا۔ عرفان صاحب نے اپنی حب الوطنی کے پیش نظر سیاہ پوش کو تحفظ کی یقین دہانی کرائی تا کہ فائل غلط ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ اسی دوران سیاہ پوش کو بگ باس کی طرف سے دھمکی آمیز فون آیا کہ باس کے آدمی فائل کے حصول اور سیاہ پوش کے قتل کی غرض سے عرفان صاحب کی کوٹھی تک پہنچنے والے ہیں۔ عرفان صاحب نے سیاہ پوش کو ملکی مفاد میں تعاون کرنے پر مکمل تحفظ کی یقین دہانی کرائی اور انسپکٹر جمشید کو فون کیا۔ جبکہ سیاہ پوش اور اس کے ساتھیوں نے ملکی بقا کے لیے اور عرفان صاحب کے خاندان کے تحفظ کے لیے گھر کی اہم پوزیشنیں سنبھال لیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کوٹھی میں پہنچ چکے تھے۔ ادھر باس اور اس کے ساتھی بھی کوٹھی میں پہنچ چکے تھے۔ باس کے ساتھیوں نے استاد کو قتل کی دھمکی دی اور عرفان صاحب سے وہ اہم فائل حاصل کر لی۔ باس کے ساتھی جاتے جاتے انہیں قتل کرنے ہی والے تھے کہ ایک تیسرا پراسرار شخص وہاں پہنچ کر فائل لے کر بھاگ نکلا۔ جاتے جاتے تیسرا شخص کوٹھی میں آنسو گیس کا دھماکہ کر گیا۔ آدھ گھنٹے بعد اکرام اور پولیس تفتیش کے لیے وہاں

موجود تھی۔ انسپکٹر جمشید بھی تفتیش کی غرض سے پہنچ چکے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ انسپکٹر جمشید کے ساتھ آفاق ہادی صاحب سے تفتیش کے لیے اب کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف مڑ چکے تھے۔

قسط نمبر ۶

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... آفاق ہادی کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا نظر آیا... آخر وہ اندر داخل ہوئے... ایسے میں انسپکٹر جمشید کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

''آفاق ہادی صاحب نے ہمارے مجرم کو اس کمرے میں رکھا تھا... یہی بات ہے نا ہادی صاحب۔''

''جی... جی ہاں!'' وہ بولا۔

''شکریہ! آپ کا کہنا ہے... دو دن پہلے آپ نے اپنی چھت پر ہل چل محسوس کی... اس کے بعد آپ نے کیا کیا... یہ آپ نے نہیں بتایا۔''

''میں اوپر گیا... لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔''

''آپ کا مطلب ہے... آپ نے پہلی بار اس شخص کو آج ہی دیکھا... اس سے پہلے نہیں دیکھا۔''

''جی ہاں! یہی بات ہے۔''

''تب پھر آپ نے اس کے لیے کھانے کا انتظام کیوں کر رکھا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' آفاق ہادی زور سے اچھلا۔

''وہ فائل اڑا کر سیدھا آپ کے گھر آیا... کیونکہ دو دن پہلے وہ آپ کی چھت سے لے کر عرفان صاحب کے گھر تک کے راستے کا جائزہ لے چکا تھا... اور بقول آپ کے دو دن پہلے آپ کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی... بس آج ہی آیا تھا اور کچھ دیر رک کر جب اس نے راستہ صاف دیکھا تو چلا گیا... اگر کہانی یہی ہے... تو آپ نے اسے کھانا کیوں کھلایا۔''

''آپ... آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اسے کھانا کھلایا؟'' آفاق ہادی نے پریشان آواز میں کہا۔

''میں بتاتا ہوں... بلکہ اپنی بات ثابت کرتا ہوں... یہ کمرہ آپ کا ڈرائنگ روم ہے... یہی بات ہے۔''

''جی ہاں!''

''آپ کے بیوی بچے آج گھر میں نہیں ہیں... یہی بات ہے نا؟''

''جی ہاں... وہ اپنے نانا کے گھر گئے ہوئے ہیں... میں گھر میں اکیلا ہوں۔''

''اور آپ کھانا نہیں بنا سکتے تھے... لہٰذا

آپ نے ہوٹل سے کھانا منگوایا تھا... آپ نے ہوٹل فون کیا... اور دو آدمیوں کا کھانا منگوایا... دو ہی بوتلیں منگوائیں... اور دو آدمیوں کا یہ کھانا نگینہ ہوٹل سے آیا۔''

''آپ... آخر آپ یہ باتیں کیسے کہہ سکتے ہیں۔''

''تو کیا آپ انکار کرتے ہیں۔''

''ہاں! میں انکار کرتا ہوں... جو شخص فائل لے کر آیا تھا، میں نے اسے کھانا نہیں کھلایا... نہ میں نے ہوٹل سے کھانا منگوایا... نہ بوتلیں منگوائیں... کیونکہ۔'' آفاق ہادی کہتے کہتے رک گیا۔

''کیونکہ کیا؟''

''اس نے کہا تھا... بس میں تھوڑی دیر کے لیے رکوں گا، پھر چلا جاؤں گا... اور اگر آپ نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو میرا بے آواز پستول آپ کا کام تمام کر دے گا... اس لیے میں مجبور ہو گیا... ان حالات میں بھلا میں کیوں اس کے لیے کھانا منگواتا۔''

''مطلب یہ کہ میرا دعویٰ غلط ہے... دو دن پہلے آپ کی اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی... نہ اس نے آپ کے ساتھ مل کر کوئی پروگرام طے کیا۔''

''ہاں! یہی بات ہے۔'' آفاق ہادی نے جھلا کر کہا۔

''ہادی صاحب! یہ ٹھیک ہے... آپ نے اس ڈرائنگ روم میں اسے کھانا نہیں کھلایا... بلکہ یہ کھانا باورچی خانے میں کھایا گیا ہے۔''

''نہیں... ہرگز نہیں۔''

''آیئے میرے ساتھ... باورچی خانے میں۔''

اب وہ باورچی خانے میں آئے:

''آپ فرش پر دو خالی بوتلیں دیکھ رہے ہیں... یہ ٹرے دیکھ رہے ہیں... یہ ہوٹل کی ٹرے ہے... اس پر ہوٹل کا نام لکھا ہے... نگینہ ہوٹل... باقی پلاسٹک کی وقتی پلیٹیں چمچے وغیرہ بھی یہاں نظر آ رہے ہیں... اب آپ کیا کہتے ہیں۔''

''بس! اتنی سی بات... جب کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں... میرے بیوی بچے گئے ہوئے ہیں... ظاہر میں ہوٹل سے منگوا کر ہی کھاتا ہوں گا... آپ نے ان برتنوں کو دیکھ کر اور دو خالی بوتلوں کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ میں نے اس مجرم کو کھانا کھلایا ہے... حالانکہ یہ کھانا تو میں نے اپنے لیے منگوایا تھا... اور آپ دیکھ رہے ہیں... میں کافی ڈیل ڈول کا آدمی ہوں... میری خوراک بہت ہے... میں ایک وقت میں دو آدمیوں کے برابر کھاتا ہوں... لہٰذا اتنی سی بات سے آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ میں نے اسے یہاں کھانا کھلایا ہے... بات بس اتنی ہی ہے... وہ آیا... میں بے خبر تھا... اس نے مجھ پر پستول تان دیا،

صورتِ حال بتائی... اور کہا کہ وہ کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جائے گا... اور بس... پھر وہ چلا گیا... اب اس نے مجھ پر پستول تانا ہوا تھا... میں کیا کرتا۔''

''جس نے پستول تانا ہوا ہو... لوگ اسے پیار اور محبت سے خاص اہتمام سے کھانا نہیں کھلاتے۔'' انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

''پھر وہی... آپ اپنی بات ثابت نہیں کر سکتے... اور مجھ پر بلا وجہ رعب ڈال رہے ہیں۔''

''اوہ اچھا... بھئی محمود، فاروق اور فرزانہ۔'' انسپکٹر جمشید گھبرائے ہوئے انداز میں ان تینوں کی طرف مڑے۔

''جی... ابا جان!'' تینوں ایک ساتھ بولے۔

''میں اپنی بات ثابت نہیں کر سکا۔ تم میری بات ثابت کر دو۔''

''جی... جی... ہم ثابت کر دیں... اور آپ کی بات؟''

''ہاں بس! کر دو ثابت۔''

''جج... جی اچھا... آپ کہتے ہیں تو ثابت کر دیتے ہیں... ہمارا کیا جاتا ہے... سنیے محترم آفاق ہادی صاحب... بات دراصل یہ ہے کہ... کہ۔'' فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ہاں! کہیے... بات دراصل کیا ہے؟'' آفاق ہادی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ محمود یار... تم بتا دو... تم مجھ سے بڑے ہو نا۔''

''مم... میں... اچھا میں بتا دیتا ہوں... لیکن نہیں... فرزانہ بتائے گی... کیونکہ ایسے کام یہی کیا کرتی ہے۔''

''مم... میں... ہاں کیوں نہیں... اللہ کی مہربانی سے میں بتا سکتی ہوں... ابا جان کا کہنا بالکل ٹھیک ہے... آفاق ہادی صاحب نے اس نامعلوم مجرم کے لیے پہلے ہی کھانا منگوا لیا تھا۔''

''اوہو... ثبوت کیا ہے اس بات کا۔'' آفاق ہادی نے جھلا کر کہا۔

''وہ بیرا... جو کھانا لایا تھا۔''

''حد ہو گئی... میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے یہ کھانا اپنے لیے منگوایا تھا اور میں دو آدمیوں کے برابر کھانا کھاتا ہوں... لہٰذا بیرا تو یہی کہے گا کہ میں نے دو آدمیوں کا کھانا منگوایا تھا۔''

''تب پھر... آپ ہی بتائیں... ہم یہ بات کس طرح ثابت کریں... ابا جان کہہ رہے ہیں... یہ بات ثابت کریں... آپ کہہ رہے ہیں، ایسا ہوا ہی نہیں... درمیان میں پھنس گئے ہو... خیر آپ بھی کیا یاد کریں... ہم بھی اپنے ابا جان کی بات کو آج ثابت کر کے رہیں گے... یہ دیکھیے... فرش پر جوتوں کے نشان... آپ کے بیوی بچے چونکہ گھر میں نہیں ہیں... اور ملازم بھی

آپ نے غالباً نہیں رکھا ہوا، اس لیے باورچی خانے کی صفائی نہیں ہوئی ... فرش پر گرد موجود ہے ... لہٰذا اس شخص کے جوتوں کے نشان یہاں موجود ہیں ... جب کہ آپ کے جوتوں کے نشانات اور طرح کے ہیں ... اب اگر آپ نے اسے کھانا نہیں کھلایا تو وہ باورچی خانے میں کیا کرنے آیا تھا۔'' فرزانہ یہاں تک کہہ کر رک گئی۔

''بہت خوب فرزانہ! تم بہت اچھی رہیں ... مسٹر آفاق ہادی ... اب کہیں کیا کہتے ہیں ... میری بیٹی نے تو یہ بات بہت آسانی سے ثابت کر دی۔'' انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

''تو آپ نے بھی یہاں جوتوں کے نشانات دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا۔'' فرزانہ بولی۔

''ہاں بالکل ... مسٹر آفاق ... ہم آپ کا جواب سننے کے لیے بے چین ہیں۔''

''میرا جواب یہی ہے ... وہ کچھ وقت کے لیے گھر میں آیا ... لہٰذا اس نے باورچی خانے کا بھی چکر لگایا۔''

''یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہ بتائی۔'' انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

''بس غلطی ہوگئی۔''

''ایسی بات نہیں مسٹر آفاق خادی۔'' فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔

''خادی نہیں ... ہادی۔'' فاروق نے فوراً کہا۔

''اوہ ہاں ... سوری۔''

''کیا کہا تم نے فرزانہ ... ایسی بات نہیں۔'' محمود نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں ... وہ صرف چکر لگا کر یہاں سے نہیں چلا گیا ... بلکہ اس میز پر بیٹھا رہا ... اور میز کے دوسری طرف مسٹر آفاق بیٹھے رہے ... کیونکہ۔'' فرزانہ کہتے کہتے رک گئی۔

''یہ کیونکہ کہنے کے بعد تمہاری گاڑی رک کیوں جاتی ہے۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''پپ پتا نہیں ... کیا خرابی ہو جاتی ہے۔''

''حد ہوگئی ... اصل بات رہی جاتی ہے۔'' انسپکٹر جمشید جھلا اٹھے۔

''اوہ معاف کیجیے گا ابا جان ... اب میں یہ بات ثابت کرتی ہوں کہ ہمارا مجرم یہاں باقاعدہ بیٹھا رہا ہے ... وہ صرف باورچی خانے کا چکر لگانے نہیں آیا تھا ... ادھر میز کے نیچے دیکھیے ... جوتوں کے صرف اگلے حصے کے نشانات، کیونکہ جب کوئی کھانے کی میز پر بیٹھا ہوتا ہے تو عام طور پر پورا جوتا نہیں ٹکاتا ... کبھی پورا بھی ٹک جاتا ہے ... لیکن عام طور پر جوتے کا اگلا حصہ ٹکاتا ہے ... اب یہاں اس جوتے کے اگلے حصے کے کتنے ہی نشانات ہیں ... اب بھی اگر مسٹر آفاق ہادی اس سے انکار کریں گے تو ہم کوئی اور قدم

اٹھا سکیں گے ... لیکن میرا خیال ہے ... اب یہ انکار نہیں کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک ... مسٹر ہادی ... اب آپ کیا کہتے ہیں۔''

''یہ کہ آپ لوگ حیرت انگیز ہیں ... اور یہ کہ آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے ... ایسا ہی ہوا ہے ... لیکن پھر بھی بات یہی ہے کہ اس جرم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

''تب پھر واضح کریں ... آپ نے اسے کھانا کس خوشی میں کھلایا۔''

''آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ دو دن پہلے اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔''

''کیا!!!'' محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ کہا۔

''ہاں! اس نے مجھے اپنا سارا پروگرام بتایا تھا ... اور اس نے کہا تھا ... وہ عرفان صاحب کے گھر چوری کی ایک واردات کرے گا اور میرے مکان کے ذریعے فرار ہوگا ... اس سلسلے میں اگر آپ مدد کریں تو ایک بھاری رقم مجھے دے گا ... بس میں لالچ میں آ گیا ... اور۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''اور کیا۔''

''آپ کو پتا ہے ... لالچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک بات ہے ... تو آپ اندھے ہو گئے تھے۔'' فاروق نے جلدی سے کہا۔ انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔

''ہاں!'' اس نے کہا۔

''تب پھر تو میں اپنے ماتحت کو بلاتا ہوں ... وہ آپ کو گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دے گا۔''

''ضرور ایسا کریں۔''

''تو وہ کس وقت یہاں سے گیا۔''

''کھانا کھاتے ہی چلا گیا۔'' آفاق ہادی نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے ... آپ اب بھی سچ نہیں بول رہے ... کیونکہ۔''

انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ تیر گئی۔

(جاری ہے......)

☆☆☆☆☆

یاد رکھنے کی باتیں

☆جس نے طلب علم میں وفات پائی وہ شہید ہوا۔

☆بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کریں۔

☆اپنے ظاہر و باطن کو یکساں رکھو۔

☆جو عیب سے آگاہ کرے وہ دوست ہے۔

☆خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆معافی نہایت اچھا انتقام (بدلہ) ہے۔

مرسلہ: ثناء اقبال، لانڈھی، کراچی

سندباد کے کامیاب ساتھی

ساتھیو! قرعہ اندازی کے ذریعے پانچ خوش نصیب قارئین کو اعزاز حاصل ہوا ہے سندباد کے سفر میں شریک ہونے کا۔کراچی کے قارئین کر سکیں گے ''سندباد امیوزمنٹ پارک'' کی ایک دن کی مفت سیر جبکہ دیگر شہروں اور ممالک کے کامیاب قارئین کو دیئے جائیں گے خوبصورت تحائف......!!! کامیاب ساتھیو کو مبارکباد!

انعامی سلسلہ نمبر ۱۰	انعامی سلسلہ نمبر ۱۱
۱۔معاذ اسلم (کراچی)	۱۔نوفل صلاح الدین (کراچی)
۲۔سندس آسیہ (کراچی)	۲۔خضر حیات (کراچی)
۳۔فرقان امین (کراچی)	۳۔عائشہ عبداللہ (جدہ)
۴۔سارہ بختیار (لاہور)	۴۔مریم شکور (کوٹری)
۵۔عبدالکریم لاکھانی (میرپورخاص)	۵۔صارم احمد (کراچی)

قرآن محفل

ڈیئر پنسل کے تعاون سے خصوصی تحفہ کے مستحق ساتھی

اکتوبر	نومبر
۱۔جویریہ یوسف (کراچی)	۱۔سمیعہ کنول (کراچی)
۲۔ایمن ندیم (کراچی)	۲۔محمد عدنان مجید (کراچی)

صحرا کا جہاز

محمد علی

ہزاروں سال پہلے صحراؤں میں سفر کرنے کے لیے مجھے بطور سواری استعمال کیا جانے لگا، میری سخت کھال کی وجہ سے صحرا کی گرم ریت میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ویسے بھی میں کئی دن تک بھوکا پیاسا سفر کرسکتا ہوں۔ مجھے صحرائی لوگ ''صحرا کا جہاز'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اب تو آپ یقیناً جان گئے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟۔

جی ہاں! میرا نام اونٹ ہے۔

میری چھ مختلف اقسام ہیں۔ جن میں سے دو مشہور ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (عربی قسم، بیکٹیرین قسم) عربی قسم میں میرا صرف ایک کوہان ہوتا ہے۔ بیکٹیرین قسم میں میرے دو کوہان ہوتے ہیں۔

پیارے بچو! میری عربی قسم کا قد 6 سے 8 فٹ تک ہوسکتا ہے اور وزن 15 سے 17 من تک ہوتا ہے جب کہ میری بیکٹیرین قسم کا قد عرب قسم سے چھوٹا ہوتا ہے، میری اس نسل کے نر کا وزن 16 تا 18 من تک ہوتا ہے اور مادہ کا وزن 12 من تک ہوسکتا ہے۔

پیارے بچو! آپ نے اپنے استاد اور

والدین سے یہ بات سنی اور پڑھی ہوگی کہ میں بغیر کچھ کھائے پیے بھی سفر کرسکتا ہوں، یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ میں ایک ہفتے کچھ کھاؤں نہ ہی پیوں تو زندہ رہ سکتا ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے کام آنے میں خصوصی طور پر یہ صلاحیت عنایت کی ہے۔

میری خوراک میں مختلف اقسام کے صحرائی پودے اور درخت شامل ہیں۔ مجھے کیکر کے پتے اور ٹہنیاں بہت پسند ہیں۔ میں انہیں بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ پانی پینے پر آجاؤں تو ایک وقت میں ساٹھ لیٹر تک پی جاتا ہوں۔ اس کے بعد اگر کوئی سبب نہ بنے خوراک کا تو میں اسی کو استعمال کرتا ہوں۔

پیارے بچو! آپ نے کبھی میرے پاؤں پر غور کیا ہے۔ آپ کو یہ بات پریشان کرتی ہوگی کہ میری ٹانگیں اتنی پتلی پتلی اور پاؤں چھوٹے کیوں ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خاص طرح کے پاؤں عطا کیے ہیں۔ ہر پاؤں میں صرف دو انگلیاں ہوتی ہیں، نیچے سپاٹ اور چوڑے گدے ہوتے ہیں۔ خاص قسم کے پیروں کی وجہ سے میں صحرا میں آسانی سے چلتا ہوں۔

میری عربی قسم گاڑی کے ذریعے سو من تک وزن کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ

بیکٹیرین قسم چھ سے آٹھ من وزن اٹھا کر سفر کر سکتی ہے۔ میری دونوں قسمیں ایک دن میں 4 کلو میٹر تک سفر کر سکتی ہیں۔

پیارے بچو! میری عربی قسم کی رفتار چھ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور یہ 24 گھنٹے میں تقریباً ایک سو ساٹھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ بیکٹیرین قسم کی رفتار چار کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور وہ ایک دن میں 47 کلو میٹر کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔

میں تین سال میں جوان ہوتا ہوں۔ میری عام طور پر عمر 25 سے 30 سال تک ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت میرا وزن 40 کلو گرام تک ہوتا ہے۔

میری عربی نسل ترکی، ایران، شام، عراق، سعودی عرب، قطر، پاکستان، بھارت اور افریقا میں پائی جاتی ہیں، دو کوہان والی نسل چین، منگولیا اور تبت وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔

پیارے بچو! ایک کام کی بات بتاؤں کہ عربی قسم کو صحرائی جہاز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بیکٹیرین قسم کو سردی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری یہ قسم سخت ترین موسم میں زندہ رہتی ہے۔ مجھے انسان اور بہت سے کاموں میں استعمال کر رہے ہیں۔ میرا دودھ اور گوشت بہت لذیز ہوتا ہے۔ جو لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ میری کھال سے بہت سی اشیاء بنتی ہیں اور میری اون سے لباس تیار کیے جاتے ہیں۔

پیارے بچو! مجھے ہر دور کے لوگوں نے پسند کیا ہے اور ابھی بھی کر رہے ہیں۔ میرے نام سے مختلف محاورے بھی اردو ادب میں شامل کیے گئے ہیں۔ چند ایک آپ کو بتا دیتا ہوں تا کہ آپ اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے
نہ جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا
اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی

جی جناب یہ تھے وہ محاورے جو مجھ پر بنائے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ میں انسان کی زندگی میں کتنا اہم ہوں۔ پیارے بچو! یہ میرا تعارف ہے جو کہ یقیناً آپ کو دلچسپ لگا ہوگا۔

☆......☆

دلچسپ معلومات

☆ ہاتھی ایسا جانور ہے جو زندگی میں چھ مرتبہ دانت بدلتا ہے۔

☆ بچھو کے چاروں طرف آگ لگا دی جائے تو وہ اپنے آپ کو ڈس لیتا ہے۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ بندر بھارت میں پائے جاتے ہیں۔

☆ کتا سرخ اور سبز رنگ نہیں دیکھ سکتا۔

☆ جگنو کی روشنی بغیر حرارت کے پیدا ہوتی ہے۔

مرسلہ: اسامہ احمد، کراچی

ماہنامہ ''ساتھی'' میں قسط وار شائع ہونے والا مقبول عام ناول

گوریلا فائٹرز ۲

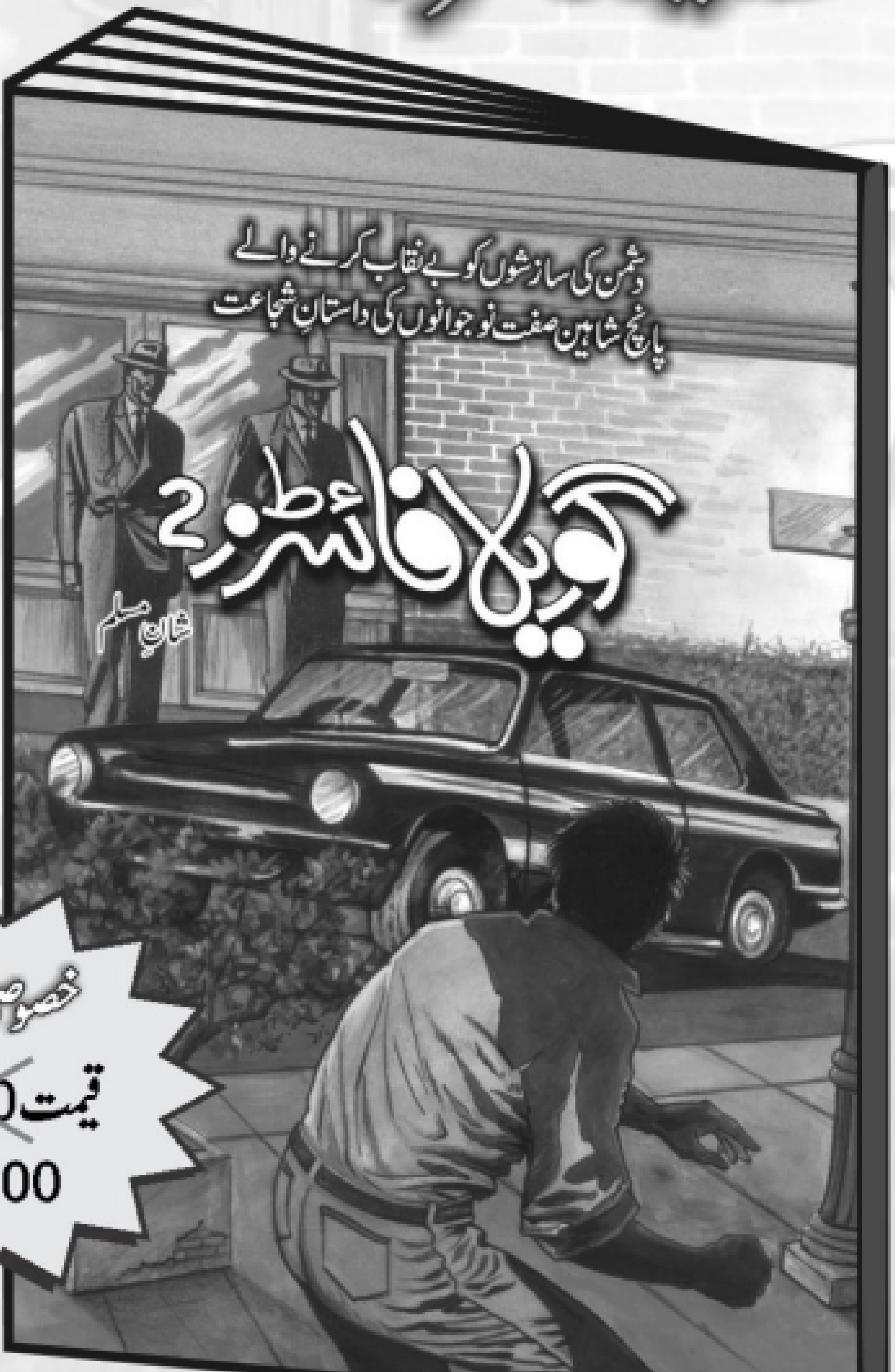

خصوصی رعایت

قیمت ~~140~~ روپے

100 روپے

اب کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے

رابطہ کیجیے

ادارہ مطبوعات طلبہ کراچی

شاپ نمبر 25، سلیم ایوینیو بلاک 13-B، یونیورسٹی روڈ، گلشن اقبال، کراچی۔

فون: 021-34982343 فیکس: 021-34986418

سب سے بڑا جھوٹ

ابرار محسن

نہ جانے کب کی بات ہے کسی شہر میں تین بھائی رہتے تھے اور ان تینوں میں ہی ایک بڑا عیب تھا۔ وہ عادتاً جھوٹ بولتے تھے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ سارے شہر میں بدنام تھے۔ ان کی باتیں سن کر لوگ ان پر ہنستے تھے ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ تینوں بھائی سڑک پر کہیں جا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ شہزادی کی پالکی آ رہی ہے۔ بے چارے غلاموں نے

کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ چاروں پسینے میں شرابور تھے۔ شہزادی نے سونے چاندی کے تاروں سے بنا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

اس کو دیکھ کر ایک بھائی نے کہا۔''اس کے پاس دولت ہے اور ہمارے پاس باتیں بنانے کا فن۔ ان دونوں چیزوں میں کس کا پلہ بھاری ہے؟'

دوسرا بولا''ہماری باتوں کے سامنے اس کی دولت کی کوئی حیثیت نہیں۔''

تیسرا بولا''چلو ہم اپنی باتوں سے اس کو شکست دیں''

انہوں نے بلند آواز میں شہزادی سے کہا''زیور کپڑے پہننا آسان ہے مگر باتیں کرنا سب سے مشکل کام ہے۔کیا باتوں میں تم ہمارا مقابلہ کر سکتی ہو؟''

''کیسا مقابلہ؟''شہزادی نے پالکی ٹھہرا کر پوچھا۔

''باتیں تو سب ہی کر سکتے ہیں''

انہوں نے جواب دیا''تو پھر ہو جائے مقابلہ؟''

''پہلے تم ہم سے کچھ کہو۔اگر ہم اس پر یقین نہ کریں تو ہم تینوں تمہارے غلام بن جائینگے۔اور اگر تم نے ہماری کسی بات کو جھوٹ کہا تو تمہیں ہماری غلامی میں رہنا ہوگا۔'' شہزادی نے وہ عجیب مقابلہ قبول کرلیا۔

دراصل ان بھائیوں کو غلام کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو شہزادی کو غلام بنا کر اس کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

''ہمارے مقابلے کی ہار اور جیت کا فیصلہ کون کرے گا''شہزادی نے سوال کیا۔

''جو پہلا راہگیر گزرے گا وہ فیصلہ کرے گا''بھائی ایک ساتھ بول اٹھے۔شہزادی پالکی سے اتر آئی اور چاروں ایک برگد کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔

بھائیوں کو یقین تھا کہ جیت انکی ہوگی کیونکہ ان کی کسی بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا کسان ادھر سے گزرا اور وہ ان کا فیصلہ سنانے پر رضامند ہوگیا۔

شہزادی نے کہا''پہلے تم لوگ اپنی باتیں شروع کرو۔''پہلے بھائی نے کہنا شروع کیا۔

'ایک دن میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کیلے کے درخت پر جا چڑھا۔وہ درخت اس برگد سے بھی دوگنا اونچا تھا۔میں اس کے تنے پر چڑھتا چلا گیا۔پھر اس کی چوٹی پر پہنچ کر اس کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔جب وہاں بیٹھے بیٹھے دن ڈھلنے لگا تو میں نے سوچا کہ اب نیچے اتروں مگر نیچے اترنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ اوپر چڑھنا۔میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کیا کروں۔اتنی اونچائی سے بغیر سیڑھی کے کیسے اترتا۔یہی سوچ کر میں اپنے پڑوسیوں سے سیڑھی مانگتا پھرا مگر کسی نے مدد نہیں کی۔آخر ایک پڑوسی کو مجھ پر ترس آگیا اور مجھے سیڑھی دے دی

اور میں سیڑھی لگا کر نیچے اتر آیا۔'' اس کہانی کو سن کر شہزادی خاموش بیٹھی رہی اور اس نے نہ تو زبان سے اور نہ چہرے کے تاثر سے ظاہر کیا کہ اسے کہانی پر یقین نہیں آیا۔ پہلے بھائی نے مایوس ہو کر پوچھا ''کیا تمہیں یقین آ گیا؟''

شہزادی مسکرا کر بولی ''ایسی سچی کہانی پر کس کو یقین نہیں آئیگا۔''

اس کے بعد دوسرے بھائی نے کہنا شروع کیا۔

''اے شہزادی میرے بھائی کی کہانی کے اندر ایک کہانی اور بھی ہے۔۔ ہوا یہ کہ میرا بھائی کیلئے کے درخت کے پتوں میں جا چھپا اور میں اسے جنگل میں تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ مجھے اس کے پیروں کے نشان نظر آئے۔ میں ان نشانات کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ میرے سامنے ایک گھنی جھاڑی تھی اس جھاڑی میں ایک شیر بیٹھا تھا۔ میں غڑاپ سے اسکے مونہہ کے اندر چلا گیا۔ اور مونہہ سے ہوتے ہوئے اس کے پیٹ میں جا پہنچا۔ شیر مارے بے چینی کے بہت اچھلا اور لوٹیں لگانے لگا۔ جب اس کی حالت بگڑی تو اس نے الٹی کر دی۔ میں اس کے پیٹ میں سے مونہہ میں اور مونہہ سے باہر آ کر دور جا گرا۔ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میں اپنے شہر کے اندر ایک سڑک کے کنارے پڑا تھا''

اس کہانی کو سننے کے بعد شہزادی پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہی۔

دوسرے بھائی نے پوچھا ''میری کہانی میں کوئی جھوٹ تو نہیں تھا۔''

شہزادی بڑ بڑائی ''بے چارہ شیر بلا وجہ مصیبت میں پڑ گیا۔ اچھا ہوا جو تم باہر نکل آئے۔' اب تیسرا بھائی کہنے لگا۔

''ہمارے شہر میں کچھ فاصلے پر ایک ندی ہے۔ ایک دن میں ندی پر مچھلی پکڑنے گیا تو دیکھا کہ ندی کے کنارے پر بہت سے مچھیرے اداس بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ کہنے لگے۔'' اے نوجوان یہاں بیٹھ کر تو ہماری طرح وقت برباد کریگا ہم ہفتوں سے ندی میں جال ڈالے بیٹھے ہیں مگر کوئی مچھلی نہیں پھنسی۔ ہمارے بچے بھوکے ہیں۔ ان کی بات سن کر مجھے بہت ترس آیا اور میں مچھلی بن کر ندی میں کود پڑا۔ میں ندی کے پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب میں ندی کی تہہ تک پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑی مچھلی مونہہ کھولے بیٹھی مچھلیوں کو نگل رہی ہے۔ اسی وجہ سے مچھیروں کے جال تک کوئی مچھلی نہیں پہنچ رہی تھی۔ مجھے بڑا غصہ آیا میں پھر آدمی کی شکل میں آیا اور تلوار سے مچھلی کا پیٹ چیر دیا۔ اسی وقت ہزاروں مچھلیاں اس کے پیٹ کی قید سے آزاد ہو کر باہر نکل آئیں۔ مچھیروں کے جال مچھلیوں سے بھر گئے۔''

تیسرے بھائی نے کہانی ختم کی اور شہزادی کی طرف دیکھا جو سر ہلا کر مسکرا رہی تھی۔

تینوں بھائی سمجھ گئے کہ شہزادی نے ان کو ہرادیا ہے۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوئے کیونکہ وہ بھی شہزادی کو ہراسکتے تھے۔

اب شہزادی نے بوڑھے کسان کو مخاطب کیا۔

''اے بزرگ میں ایک شہزادی ہوں اور دنیا کی ہر آسائش مجھے میسر ہے۔ مجھے غلاموں کی بھی تمنا نہیں۔ دراصل میں اپنے تین بے وفا اور نمک حرام غلاموں کی تلاش میں نکلی ہوں جو میرے جواہرات لیکر بھاگ گئے تھے۔ بہت تلاش کے بعد وہ تینوں مل گئے ہیں اور میں بہت خوش ہوں۔

تینوں بھائی ہکا بکا رہ گئے۔

شہزادی ان سے کہہ رہی تھی۔''بولو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں''

بھائی بدحواس ہوگئے۔

''تم خاموش کیوں ہو؟ شہزادی نے سوال کیا۔

مگر وہ صرف گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ ان کی ہاں بھی ان کو پھنسوا دیتی اور نا بھی۔ اگر وہ کہتے کہ شہزادی جھوٹ بول رہی ہے تو شرط کے مطابق وہ اس کے غلام بن جاتے اور اگر اس کی بات کو سچا کہتے تو تو وہ خود ہی اس کی غلامی قبول کرلیتے۔

نیک شہزادی انکی بدحواسی دیکھ کر ہنس پڑی اور کسان بھی ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوگیا۔ اس کے فیصلے کی اب ضرورت نہیں تھی۔

شہزادی نے کہا۔''مجھے تم لوگوں کو غلام نہیں بنانا ہے۔ میں تو تم کو صرف سبق سکھانا چاہتی تھی کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ اور الٹی سیدھی شرطیں نہیں لگاؤ گے''

''ہم وعدہ کرتے ہیں'' تینوں نے خلوص سے کہا اور شہزادی پالکی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ شہزادی کی عقلمندی نے انہیں جھوٹ کی بری عادت سے بچ لیا تھا۔

☆......☆

مونگ پھلی (Peanut)

اسے سندھی زبان میں بوہی مگ کہا جاتا ہے۔ اس کی کاشت سب سے پہلے امریکہ میں ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند میں اس کی کاشت ۱۹ویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ جاڑوں میں یہ بڑی مفید ہوتی ہے ایک دو چھٹانک مونگ پھلی کھا لینے سے جسم میں بھرپور توانائی آجاتی ہے۔ جس سے جسم باآسانی جاڑوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ مونگ پھلی کے دانوں کو گھی اور تیل میں ہلکی آنچ پر تل کر اس میں مرچ مسالے لگانے سے بہت چٹ پٹے ہوجاتے ہیں۔ ورزش کرنے والوں کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ یہ پاکستان میں ریتیلے علاقوں میں بکثرت کاشت کی جاتی ہے۔ اس سے تیل بھی کافی مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔ مونگ پھلی کو خالی پیٹ کھانے سے بھوک ختم ہوجاتی ہے۔

لوگ قسم قسم کے کام کرتے ہیں۔ان کاموں کو گننے بیٹھیں تو کافی وقت لگ جائے۔کچھ لوگ دفتروں میں کام کرتے ہیں تو کچھ کارخانوں میں ۔ گھڑی ساز گھڑیوں کی اور مستری مشینوں کی مرمت کرتے ہیں۔معمار عمارتیں اور بڑھئی فرنیچر بناتے ہیں۔بعض لوگ بیماروں کا علاج کرتے ہیں۔انہیں ڈاکٹر کہتے ہیں۔کچھ لوگ کھیتوں میں ہل چلاتے، بیج بوتے، اناج پیدا کرتے ہیں۔انہیں کسان کہتے ہیں۔بعض لوگ اسکول میں پڑھاتے ہیں۔یہ استاد یا معلم کہلاتے ہیں۔غرض ہر شخص اپنے اپنے پیشے میں مصروف ایک بامقصد زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور اپنے خاندان کے لیے ضروریات زندگی کا بندوبست کر رہا ہوتا ہے۔

کون کیا کرتا ہے

بہت سے بچے اسکول جاتے ہیں،
جہاں استانی یا استاد انہیں پڑھتے ہیں،
وہ استاد کا کہا مانتے ہیں اور جو کچھ
وہ پڑھائیں، دل لگا کر یاد کرتے ہیں

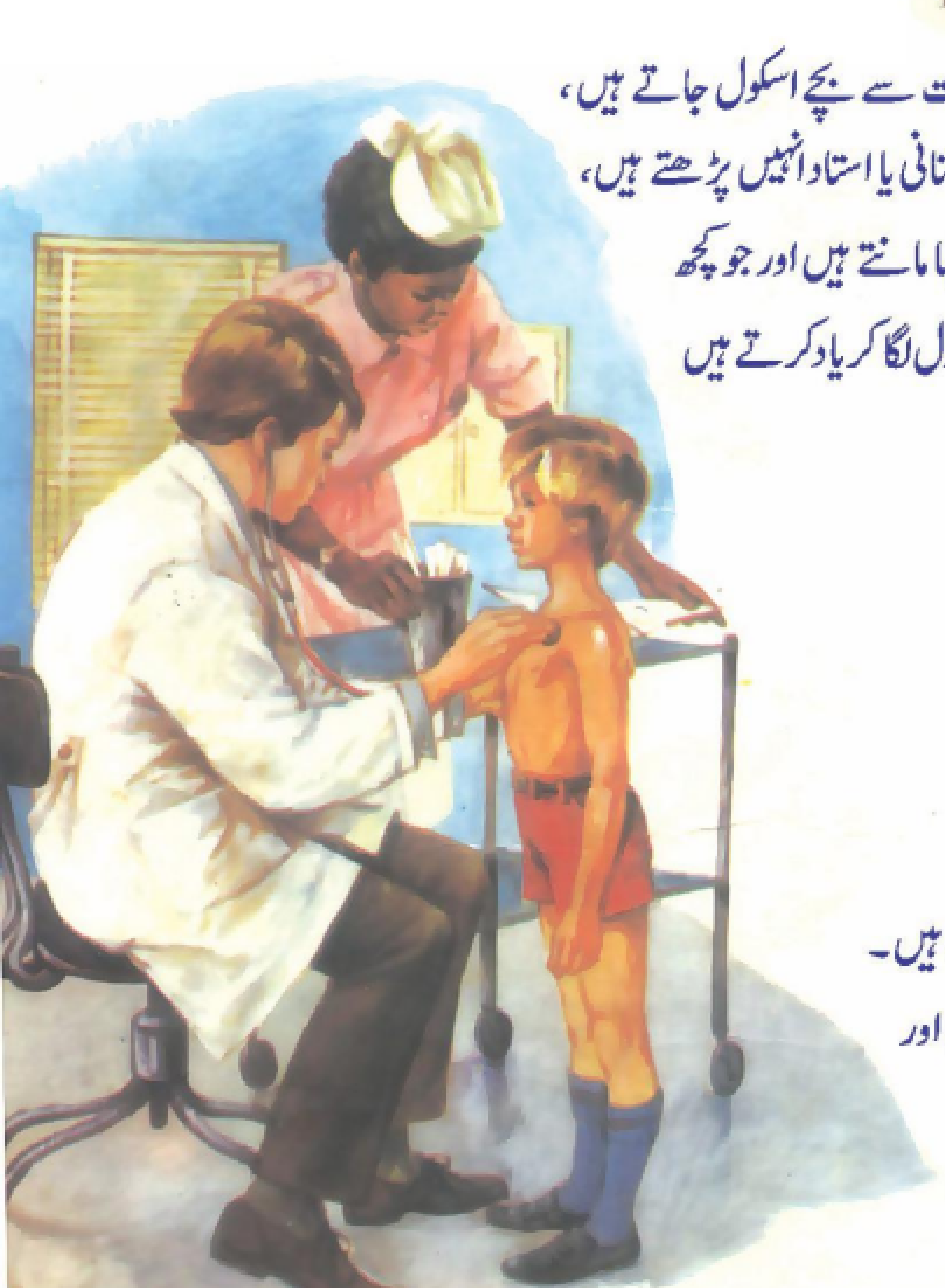

جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔
ڈاکٹر آپ کو دوا دیتا ہے۔نرس ڈاکٹر کی مدد کرتی اور
مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

کسان کھیت میں بیج بونے سے پہلے ہل چلاتے ہیں تاکہ مٹی نرم ہوجائے۔ یہ کسان کھیت میں ٹریکٹر چلارہا ہے۔
کئی ملکوں میں بیلوں سے بھی ہل چلائے جاتے ہیں۔

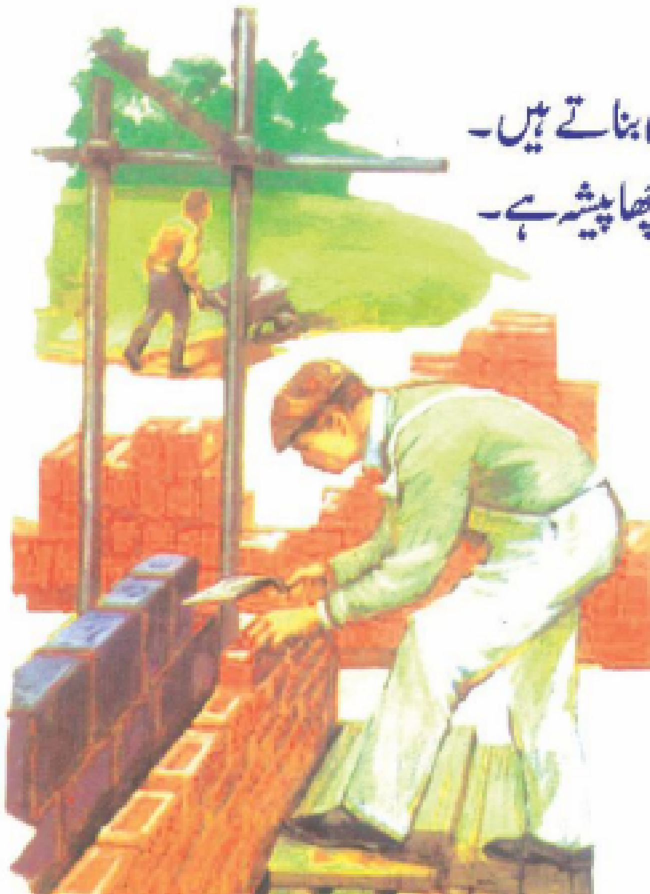

معمار عمارتیں بناتے ہیں۔
یہ بھی ایک اچھا پیشہ ہے۔

مستری کار کی مرمت کرتا ہے۔
یہ کار کے تمام پرزوں سے واقف ہوتا ہے

کان کن کان سے کوئلہ نکالتا ہے۔ وہ سر پر خود پہنتا ہے۔
خود میں لیمپ لگا ہوتا ہے۔ وہ مشینی برمے سے کوئلہ کاٹتا ہے

راجپوت کی بستی میں

ش کاظمی

مجھے سب سے زیادہ دلچسپی شیرنی کے تیسرے بچہ سے تھی

جب پہلے پہل میں نے اسے دیکھا، تو وہ بہت کم عمر تھا۔ غالباً ایک سال کا لیکن تھا بہت پیارا اور خوبصورت۔ کم سنی کے باعث وہ بے حد شریر اور چلبلا تھا اور اس کی یہی ادائیں مجھے بھا گئیں۔ ان دنوں میں کالا گڑھ فارسٹ ڈویژن میں جو بھابر ترائی کے وسیع و عریض علاقے پر مشتمل ہے۔ ایک ایسے موذی شیر کے تعاقب میں پھر رہا تھا جسے مویشیوں کو اٹھا لے جانے کی بری عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ شیر نہایت چالاک اور مکار تھا۔ کامل تین برس وہ مجھے جھکائیاں اور اڑان گھاٹیاں دیتا رہا اور کسی طرح ہاتھ نہ آیا۔ میں بھی اپنا چین اور آرام حرام کر کے اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا مگر وہ ہر مرتبہ جل دے کر نکل جاتا اور میں ہاتھ ملتا رہ جاتا تاہم اس تگ و دو

اور آنکھ مچولی کا یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ میں جنگل کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں اور جانوروں کی فطرت سے ایسے رخوں سے آگاہ ہوگیا جو پہلے میرے علم میں نہ تھے۔ سرما اور گرما کی کتنی راتیں میں نے درختوں اور مچانوں پر اس موذی کے انتظار میں کاٹیں، ان کا کوئی شمار نہیں لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ شیر بالکل اتفاقیہ طور پر کسی اور شکاری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ یہ شکاری دراصل سانبھر کی تلاش میں نکلا تھا اور اس نے شیر کو سانبھر سمجھ کر فائر کیا اور یوں اس کا قصہ پاک ہوا۔

بہرحال میں اس کم سن شیر کی داستان بیان کرتا ہوں۔

میں پکھروندی کے کنارے ایک محفوظ مقام پر بیٹھا تھا اور انتظار کر رہا تھا اسی شیر کا جو کسی اور شکاری کے ہاتھوں سانبھر کے دھوکے میں مارا گیا۔

میں اپنی کمیں گاہ میں چھپا ہوا شام کے اس حسین اور دل فریب منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس شیر کا انتظار بھی کر رہا تھا جس کے بارے میں شبہہ تھا کہ وہ ادھر سے گزرے گا۔

میرے چاروں طرف گہرا اور پرہیبت سکون طاری تھا۔ جنگل کی فضا سورج غروب ہونے کی منتظر ہوتی ہے اور جونہی سورج آخری سلام کر کے مغرب کے دامن میں منہ چھپالیتا ہے، یک لخت فضا پرندوں اور چرندوں کی ملی جلی بولیوں سے کانپ اٹھتی ہے اور پھر جنگل کی زندگی بیدار ہونے لگتی ہے۔

سورج چھپنے میں ابھی کچھ دیر تھی، لیکن شمال کی جانب سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دم بہ دم تیز ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے بدن پر کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا اور رات کا سامنا کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اعشاریہ 470 کی دو نالی رائفل میرے سامنے پڑی تھی جسے میں پلک جھپکتے ہی اٹھا کر نشانہ لے سکتا تھا۔ پانی سے بھری ہوئی بوتل اپنے اور قریب رکھ کر میں نے اپنے اس گھونسلے کو مزید محفوظ بنانے کے لیے چند شاخیں نئی ترتیب سے چنیں اور ابھی کارتوسوں کی پیٹی کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ندی کے پار ملگجے اندھیرے سے مجھے یک لخت ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دی۔

میرا جسم جیسے پتھر کا ہوگیا اور میں غور سے ندی کے پار تکنے لگا۔ ہاتھیوں کا ایک غول مجھ سے تقریباً ایک سو بیس فٹ دور ندی عبور کر رہا تھا مگر خدا کا شکر کہ انہوں نے ادھر کا رخ نہ کیا، جدھر میں بیٹھا تھا اور چوں کہ ہوا ان کی طرف سے میری جانب چل رہی تھی۔ اس لیے ان کے جسموں سے اٹھتی ہوئی بو میرے نتھنوں تک آسانی سے پہنچ رہی تھی۔ ہاتھیوں کی بصارت اگرچہ زیادہ تیز نہیں ہوتی تاہم سونگھنے کی حس بڑی قوی ہوتی ہے اور کچھ عجیب نہ تھا کہ اگر ہوا کا رخ ان کی طرف ہوتا، تو

وہ ضرور طیش میں آ کر ادھر ہی آ جاتے۔

بانس کے جنگل میں ہاتھیوں کی ڈار کے گھسنے سے مجھ پر مایوسی کی حالت طاری ہوگئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں جس شیر کی تلاش میں ہوں، وہ اس جگہ موجود نہیں۔ میں نے کمین گاہ سے نکل کر اپنے کیمپ تک جانے اور آرام سے سونے کا ارادہ کرلیا اور اس مقصد کے لیے اپنا سامان جمع کرنے لگا۔ ابھی تک میرے کانوں میں درختوں کے ٹوٹنے اور پودوں کو روندنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر یک لخت یہ آوازیں یوں تھم گئیں جیسے کبھی گونجی ہی نہ تھیں۔ جنگل کی فضا پر ایک عجیب اور پراسرار سکوت طاری ہوگیا۔ نہ کوئی پرندہ بولتا تھا اور نہ کسی چرندے کے حرکت کرنے کی آواز آتی تھی۔

یہ سکوت جو آنے والے کسی خطرے کی صریحاً نشان دہی کرتا تھا، چند منٹ ہی رہا اور پھر میں نے سنا کہ ہاتھی اپنی سونڈیں چابک کی مانند لپیٹ لپیٹ کر زمین پر مار رہے ہیں۔ اس طرح ان کی سانس کے ساتھ جو آواز نکلتی تھی وہ اس بات کا ثبوت تھی کہ انہوں نے اپنے آس پاس شیر کی موجودگی محسوس کرلی ہے۔ میں پوری طرح ہوشیار اور چوکنا ہوگیا۔ میرا اندازہ غلط تھا، فوراً ہی شیر کی طویل غراہٹ بلند ہوئی جس سے فضا تھرا اٹھی۔ آواز نر کی تھی اور پوری قوت سے نکل رہی تھی لیکن مجھے اندازہ نہ ہوسکا کہ آ کدھر سے رہی ہے اور شیر حقیقت میں ہے کس طرف...... جنگل میں اس قسم کی آوازیں شکاری کو اکثر دھوکا دیتی ہیں اور بعض اوقات اناڑی یا مبتدی قسم کے شکاری ان کے فریب میں مبتلا ہوکر بے خبری میں درندے کی خوراک بن جاتے ہیں۔ آواز کی صحیح سمت کا سراغ لگانا خاصا مشکل فن ہے جو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک شکاری اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ جنگلوں میں بسر نہ کرے۔ ایک عام شخص شیر یا چیتے کی قریب سے آتی ہوئی آواز سن کر دہشت کے مارے پیلا پڑ جاتا ہے۔ اسے بالکل یوں محسوس ہوتا ہے جیسے درندہ چند گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہے لیکن حقیقت میں وہ وہاں سے کئی فرلانگ یا میل بھر دور ہوتا ہے۔ اسی طرح مشرق کی جانب سے سنائی دینے والی آواز حقیقت میں مغرب سے آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ قدرت نے جس طرح انسان کو اپنی جان کی حفاظت کے گُر سکھائے ہیں اور اعلیٰ ذہنی و جسمانی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، اسی طرح اس نے جانوروں کی حفاظت کے لیے بھی کچھ عجیب داؤ پیچ اور نرالے طور طریقے وضع کردیے ہیں۔

بہرحال شیر دوبارہ گرجا اور اب اس کی آواز اس علاقے کی سب سے اونچی پہاڑی سے ٹکرا کر واپس آئی اور یوں سنائی دیا جیسے چاروں طرف شیر ہی شیر گرج رہے ہیں۔ چار پانچ منٹ تک وہ

مسلسل بولتا رہا اور میں ہر بار آواز کی صحیح سمت معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر اتنا اندازہ ہوا کہ وہ شمال مشرق میں ہے اور یہ اندازہ کرتے ہی میری انگلیاں رائفل پر سختی سے جم گئیں...... اس کا مطلب یہ تھا کہ شیر ندی کو عبور کرنے کے ارادے سے اسی طرف چلا آرہا ہے جہاں میں اس کے انتظار میں چھپا بیٹھا تھا۔

ہاتھیوں کی لگاتار چنگھاڑ سن کر شیر نے اپنا رخ بدل لیا تھا اور اب اس کا میری طرف آنا ممکن نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں ہاتھیوں کو کوسنے لگا کہ ان کی وجہ سے یہ رات بھی اکارت گئی اور اتنی محنت خواہ مخواہ ضائع ہوئی۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ ہاتھی جنگل میں ذرا اور دور چلے جائیں تو میں یہاں سے نکلوں اور کیمپ جا کر آرام کروں کیوں کہ طبیعت سخت بدمزہ ہو چکی تھی لیکن یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی، ہاتھیوں نے گویا طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں گے اور اس کی معقول وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آس پاس شیر کی بو پا رہے تھے۔

رات کے آٹھ بج گئے اور معاملہ جوں کا توں تھا۔ مشرقی پہاڑی کے عقب میں چاند اپنی تمام رعنائیوں کو جلو میں لیے جلوہ گرد ہوا اور آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ قریب ہی کسی درخت سے کوئی پرندہ خوشی سے چہچہایا...... ٹوک...... ٹوک...... ٹوک...... دھانک...... سانبھر کی آواز خطرے کا الارم بن کر جنگل میں گونج رہی تھی۔ وہ دیر تک اسی طرح چیختا اور جنگل کے دوسرے باسیوں کو بتاتا رہا کہ خطرہ سر پر آن پہنچا، اپنی اپنی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ چند لمحوں کے بعد سانبھر چپ ہوا، تو شمال مشرق سے خوفزدہ چیتل پکار اٹھے: تاؤں...... تاؤں...... تاؤں......

ان کے ساتھ ہی کوئی اور جانور اپنی بھاری لیکن بھرائی ہوئی آواز میں تال دے رہا تھا: ہا...... ہا...... ہا...... ہاہاہا۔ پھر سور بھی بول اٹھے اور میں نے ان میں سے ایک کو بے تحاشا ندی کی طرف بھاگتے دیکھا۔ سور جس انداز میں بھاگا تھا، وہ انداز مجھے خبردار کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یقیناً شیر اسی حصے میں آن پہنچا ہے۔ چاند کی تیز روشنی میں مجھے ندی اور اس کا نواحی علاقہ بخوبی نظر آرہا تھا اور میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا کہ جنگلی سور ندی کے عین بیچ میں پناہ لیے ہوئے ہے۔

مجھ سے تیس فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے سے سیاہ رنگ کے چٹانی پتھر کی ایک محفوظ آڑ میں بھینس کا وہ بچھڑا بیٹھا اطمینان سے جگالی کر رہا تھا جسے میں نے شیر کو پھانسنے کے لیے باندھا تھا۔

یکایک شیر پھر بولا اور اس مرتبہ چیتل ہرنوں کا ایک چھوٹا سا گروہ میرے دائیں جانب سے برآمد ہوا اور قلانچیں بھرتا ہوا دوسری جانب گھنی گھاس میں غائب ہوگیا۔ یہ چیتل اس برق رفتاری سے دوڑے کہ میں حیران رہ گیا۔ اب

جنگل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ادھم مچ گیا کہ بادشاہ سلامت اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آن پہنچے اور رعایا کے کسی نہ کسی کمزور فرد کا خون چوس کر ہی ٹلیں گے۔

میں اپنی جگہ پوری ہوشیاری اور ذہنی بیداری کے ساتھ بیٹھا شیر کی ایک جھلک دیکھنے کا منتظر تھا لیکن ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ اب میرے اعصاب جواب دینے لگے اور طبیعت بری طرح جھنجھلانے لگی۔

میرے لیے مزید انتظار کرنا دشوار ہوگیا۔ ہاتھی اب خاصی دور جا چکے تھے اور شیر کے بھی ادھر آنے کا کوئی امکان نہ تھا، چنانچہ میں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا اور سب کچھ اپنے تھیلے میں بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن میری نگاہیں ساٹھ فٹ کے فاصلے پر جمی ہوئی تھیں جہاں لمبی لمبی گھاس زور زور سے ہل رہی تھی اور کچھ اس قسم کی آواز اٹھنے لگی تھی جیسے کتیا کے بچے آپس میں کھیل رہے ہوں اور پھر گھاس میں سے چار جانور برآمد ہوئے، تین چھوٹے اور ایک بڑا، چوں کہ وہ ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں چاند کی روشنی اچھی طرح نہیں پہنچ رہی تھی، اس لیے پہلی نظر میں یوں معلوم ہوا کہ یہ لکڑ بگے ہیں اور غالباً کوئی مادہ اپنے تین بچوں کو لے کر مٹر گشت کے لیے نکلی ہے لیکن نہیں لکڑ بگے ایسے تو نہیں ہوتے، ان کی تو چال ہی کچھ اور ہوتی ہے، ریچھ بھی نہیں، چند ثانیوں کے لیے میرا ذہن ماؤف ہوگیا۔ جانور میرے سامنے تھے اور میں انہیں شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں نے خوب غور سے دیکھنا شروع کیا اور جونہی وہ چاروں کسی قدر کھلی جگہ میں آئے جہاں روشنی تھی تو بے اختیار میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ خدا کی پناہ! میں بھی کتنا احمق ہوں کہ انہیں پہچان نہ سکا۔ ایک خوبصورت اور جوان شیرنی تھی۔ جو اپنے تین بچوں کو لے کر جنگل میں تفریح کر رہی تھی۔

میں کئی منٹ تک بت بنا کھڑا ان بچوں اور شیرنی کو دیکھتا رہا اور اپنے کو مطلق بھول گیا۔ شیرنی نہایت سکون سے بیٹھی تھی اور تینوں بچے کبھی آپس میں کھیلتے اور کبھی اپنی ماں سے لپٹنے لگتے۔ میں نے دیکھا، ان میں سب سے چھوٹا بچہ بے حد شریر ہے وہ نہ صرف اپنے بڑے بھائیوں سے کشتی لڑتا بلکہ ماں کو بھی بری طرح تنگ کر رہا تھا جب وہ اس کی پشت پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو شیرنی ہلکا سا ہاتھ مار کر اسے پرے پھینک دیتی۔ پندرہ بیس منٹ یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر شیرنی وہاں سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ میں پھر اپنی کمین گاہ میں دبک گیا۔ موقع ایسا تھا کہ میں نہایت آسانی سے اس شیرنی کو نشانہ بنا سکتا تھا، مگر اس کے بچوں کا خیال کرتے ہوئے اس حرکت سے باز رہا اور ویسے بھی میری اس شیرنی سے کوئی عداوت نہ تھی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ کم سن بچوں کو لکڑ بگوں کے منہ کا تر نوالہ بننے کے لیے جنگل میں تنہا چھوڑ دوں اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ظالم اور سنگ دل شکاری ایسی حرکتیں کرتے ہیں لیکن یہ شکاری کی روح کے خلاف ہے۔

تینوں بچے ایک ایک سال کے تھے لیکن انہیں شکار مارنے اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ابھی مزید تربیت کی ضرورت تھی۔ شیرنی کے بچے پانچ سال کی عمر میں پورے بالغ اور جوان ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں اپنی ماں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس دوران میں شکار پر جھپٹنے اور پکڑ کر لے جانے کا فن اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں۔ ابتدائی تین سال ماں کی نگرانی اور حفاظت میں گزرتے ہیں، وہ ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتی۔ پیدا ہونے کے بعد پانچ ماہ تک وہ ماں کے دودھ پر پلتے ہیں، پھر ان کے جبڑوں میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ کچلا ہوا گوشت کھا سکیں۔ یہ گوشت ماں انہیں اپنے دانتوں سے کچل کر کھلاتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بچے چھوٹے چھوٹے جانوروں اور پرندوں کو خود مار کر ہڑپ کرنے لگتے ہیں۔ پہلے پہلے خرگوش، گیدڑوں اور موروں وغیرہ کی باری آتی ہے، پھر چیتل ہرن ان کا نوالہ بنتے ہیں اور آخر میں بڑے جانور سانبھر، نیل گائے اور دوسرے مویشی! اس دوران میں اگر آدمی کا خون ان کے منہ کو لگ جائے تو پھر نہ کسی جانور کا گوشت انہیں پسند آتا ہے، نہ لہو...... ہر وقت اور ہر لمحے آدمی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

☆......☆

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ چاند اب میرے سر پر چمک رہا تھا اور اس کی روشنی بھینس کے بچھڑے پر اس انداز سے پڑ رہی تھی کہ شیرنی ذرا بھی گردن گھماتی تو اسے دیکھ لیتی۔ ادھر بچھڑے کو بھی شیرنی کی موجودگی کا پتا چل گیا تھا اور اس میں بے چینی اور اضطراب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اس سے پہلے وہ مزے سے کان ہلا ہلا کر جگالی کرتا اور آنکھیں جھپکا رہا تھا لیکن درندے کی قربت کا احساس ہوتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔ شیرنی اپنے دونوں اگلے پنجے ریت پر پھیلائے آرام سے بیٹھی تھی اور اس کے بچے اسی طرح شوخیاں اور اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر انہوں نے بچھڑے کو دیکھ لیا تو ضرور اس پر حملہ کر دیں گے اور ایک بار تو شیرنی کا بڑا بچہ اس کے نزدیک پہنچ ہی گیا تھا کہ ماں نے ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اسے واپس بلا لیا۔ تیسرا اور چھوٹا بچہ جو سب سے زیادہ شریر تھا، مسلسل بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ غالباً اس کے نتھنوں میں بچھڑے کی بو پہنچ رہی تھی۔ یک لخت وہ اچھلتا ہوا سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے گھبرا کر رائفل تان لی۔ وہ مجھ سے صرف چھ فٹ کے فاصلے پر آن رک گیا اور چمکدار زرد زرد آنکھیں نیم وا کر کے بڑی حیرت سے مجھے گھورنے لگا۔

اگرچہ میں نے شاخوں اور خاردار جھاڑیوں سے یہ کمین گاہ خاص محفوظ بنالی تھی اور کوئی جانور آسانی سے میرا سراغ نہ پاسکتا تھا۔لیکن شیرنی کا یہ شریر بچہ مجھے دیکھ چکا تھا، پھر وہ منہ کھول کر ہلکی آواز سے غرایا، میں اپنی جگہ اور دبک گیا، جانتا تھا شیرنی کو پتا چل گیا تو جان پر کھیل جائے گی مگر اپنے بچوں پر آنچ نہ آنے دے گی۔

اتنے میں اس کی ماں غرائی اور بچہ تیزی سے اس کی طرف بھاگا اور جب وہ بچھرے کے قریب سے گزرا تو بچھڑے نے ڈر کے مارے کوئی حرکت کی۔ غالباً اس نے کان ہلائے تھے۔اس کی یہ حرکت شیرنی کے بچے کو روکنے کے لیے کافی تھی۔ وہ رک گیا اور بچھڑے پر غرانے لگا۔ بچے کی آواز سنتے ہی شیرنی نے نہ جانے کیوں کر اندازہ کرلیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔وہ فوراً اٹھی اور بچے کی طرف آئی۔ میں سمجھ گیا کہ بچھڑا ہاتھ سے گیا۔ اس وقت بھی چاہتا تو گولی چلا کر شیرنی کو ختم کرسکتا تھا۔لیکن طبیعت آمادہ نہ ہوئی اور میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

شیرنی نے اپنے بچوں کو پیچھے کیا اور خود نہایت وقار سے قدم بڑھاتی ہوئی بچھرے کی طرف گئی۔ اس کی آنکھیں یاقوت کی مانند سرخ تھیں اور ان میں بے پناہ چمک تھی۔شیرنی کو اپنے قریب پاکر بچھرے کے حلق سے نہایت ڈراؤنی آواز نکلی۔ عین اسی لمحے نہ معلوم مجھے کیا ہوا۔ میں نے تالی بجائی۔ بچھڑے کی طرف بڑھتی ہوئی شیرنی یکدم یوں رک گئی جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ایک لحظے کے لیے اس نے گردن گھما کر میری کمین گاہ کی طرف دیکھا اور پوری قوت سے گرجی۔ میرا کلیجہ لرز گیا اور جسم برف کی مانند سرد۔اس وقت اگر فائر کرنا بھی چاہتا تو نہ کرسکتا تھا۔اتنا یاد ہے کہ میں نے رائفل کا دستہ سختی سے بھینچ لیا تھا لیکن کانپتے ہوئے ہاتھوں پر قابو پانے کی کوئی تدبیر میرے پاس نہ تھی۔

شیرنی خوب گرج رہی تھی۔دھاڑ رہی تھی......اس کا غیظ وغضب قابل دید تھا۔ ہر گرج سے اس کے غم و غصے کا اظہار ہوتا تھا کہ اس کے آرام اور تفریح میں مداخلت کیوں کی گئی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے رائفل کندھے سے لگائی اور شیرنی کی کھوپڑی کا نشانہ لیا، مگر فوراً ایک ہولناک گرج شیرنی کے حلق سے نکلی اور میرے ہاتھ کانپنے لگے۔اب مجھے یہاں سے نکل بھاگنے کی سوجی، مگر ایسا کرنا صریحاً موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ یقیناً میرا پیچھا کرتی۔ مجھے اپنی حماقت پر انتہائی غصہ آرہا تھا کہ میں نے شیرنی کی توجہ خواہ مخواہ بچھڑے سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرائی۔

میں نے تیسری بار اس کے سر کا نشانہ لیا......مگر بزدلی کہیے یا شیرنی کے بچوں کی محبت کہ میری انگلی لبلبی نہ دباسکی۔ وہ میرے سامنے سینہ تانے

بہادری کی تصویر بنی کھڑی للکار رہی تھی، لیکن مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ کاش یہ بچے اس کے ساتھ نہ ہوتے...... معاً شیرنی کے تینوں بچے بچھڑے کی طرف لپکے اور عین اسی لمحے میری رائفل نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں اگل دیں۔ یہ فائر میں نے ہوا میں کیے تھے اور ان کا نتیجہ اچھا نکلا۔ شیرنی سراسیمہ ہوگئی اور چند لمحے بعد وہاں سوائے میرے اور سیاہ بچھڑے کے کوئی نہ تھا۔

مجھے شیرنی اور اس کے تین بچوں سے واقعی عشق ہوگیا۔ وہ بھی ایسا کہ میں انہی کی تلاش میں شب و روز مارا مارا پھرتا۔ بڑی مشکل سے ہزار آفتوں اور مصیبتوں کے بعد ان کی صورتیں دیکھائی دیتیں لیکن جونہی وہ مجھے دیکھتے، شرما کر بھاگ جاتے۔ میں ان کی اسی ادا پر مرمٹا تھا۔ میں نے کئی بار ان کی تصویریں اتارنے کی بھی کوشش کی، مگر کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی۔

مجھے سب سے زیادہ دلچسپی بلکہ محبت شیرنی کے تیسرے بچے سے تھی۔ حالات کی ستم ظریفی نے پورے پانچ برس تک مجھے اس کا دیوانہ بنائے رکھا لیکن ایک روز مجھے اس بچے کو جو اس وقت تک بالغ اور پورا شیر بن چکا تھا، موت کے گھاٹ اتارنا پڑا۔ یہ داستان جتنی عجیب ہے، اتنی ہی دلدوز اور دلخراش تھی۔

اپریل کا مہینہ تھا کہ میں پھرتا پھرتا راجی والا کی طرف آنکلا یہ راجپوتوں کی بستی تھی۔ انتہائی مہمان نواز، بہادر اور شریف لوگ۔ انہوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بستی پر ایک عمر رسیدہ راجپوت ٹھاکر امیر سنگھ کا بڑا اثر تھا۔ بستی کا ہر شخص اس کا احترام کرتا اور سب لوگ ٹھاکر کو بھائی صاحب کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ اپنی سادہ اور چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتے تھے اور میں ان سے وہیں ملا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے جنگل کے تمام جانوروں کا تذکرہ کیا اور مختلف شیروں کی نشاندہی کی کہ ان میں کون شریف ہے اور کون شریر۔ میں نے ان سے شیرنی اور اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھائی صاحب کی معلومات کہاں تک صحیح ہوتی ہیں۔ انہوں نے ان کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور بلاشبہ تمام باتیں ٹھیک تھیں۔ قصہ یہ تھا کہ شیرنی کی ان تین اولادوں میں دو شیرنیاں تھیں۔ جن میں چھوٹا بچہ زندہ ہے اور قوی ہیکل شیر بن چکا ہے۔

''جناب، اس نے گاؤں والوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے۔'' بھائی صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ ''ایسی اوچھی حرکتیں کرتا ہے جو کسی شیر کے شایان شان نہیں ہیں۔ بھیڑ بکریوں یا گایوں کو اٹھا کر لے جانا بھلا کہاں کی شرافت ہے؟ یہ جنگل سانبھروں اور چیتل ہرنوں سے پٹا پڑا ہے۔ وہ چاہے، تو زندگی بھر ان کے لہو اور گوشت سے اپنا

پیٹ بھرے، لیکن نہ جانے اسے کیا ہوگیا ہے کہ ہمیشہ پالتو جانوروں کو پکڑ کر لے جاتا ہے۔''

بھائی صاحب کی زبانی اپنے محبوب شیر کے یہ کرتوت سن کر مجھے سخت صدمہ ہوا، مگر کچھ نہ کہا۔

بھائی صاحب کی تقریر جاری تھی:

''بڑا اچھا ہوا کہ آپ آگئے، اب اس بدبخت کا قصہ پاک ہوجائے گا۔کوئی گڈریا اپنے مویشیوں کو جنگل میں چرانے نہیں لے جاتا اور جانوروں کی صحتیں خراب ہورہی ہیں۔اگر آپ کہیں تو میں کل صبح آپ کے ساتھ چلوں اور دکھاؤں کہ وہ کیسی حرکتیں کرتا ہے۔'' میں نے حامی بھرلی۔

اگلے روز علی الصباح میں، بھائی صاحب اور ایک گڈریا جنگل میں نکلے۔گڈریے نے چند بھینسوں اور گایوں کو ساتھ لے لیا تھا اور میں نے اسے دلاسا دیا تھا کہ اگر شیر نے کوئی شرارت کی تو میں اسی وقت اسے گولی ماردوں گا۔

بھائی صاحب بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ اگر اس شیر کو مارا نہ گیا تو یہ ایک دن ضرور آدم خور بن جائے گا۔ میرے پاس انہیں جھٹلانے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، کیونکہ بہرحال ان کا تجربہ کہیں زیادہ پختہ اور معلومات نہایت ثقہ تھیں۔اس کے علاوہ میں زبانی طور پر بھی یہ اقرار کرچکا تھا کہ اس شیر سے لوگوں کو نجات دلا دوں گا، لیکن دل عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ بھائی صاحب نے گاؤں سے کچھ فاصلے پر شیر کے قدموں کے نشان دکھاتے ہوئے کہا:

''دیکھئے یہ نشان اسی کے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدمعاش رات کو یہاں پھرتا رہا ہے۔'' میں نے ان نشانوں کو غور سے دیکھا اور شیر کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ میرے حساب سے اس کا قد نو فٹ سے زائد نہ تھا اور وزن تین سوا تین سو پونڈ کے لگ بھگ۔اس موقعے پر میں نے بھائی صاحب کو قائل کرنے کی حماقت کی اور کہا۔

''ٹھاکر صاحب، یہ شیر تو ابھی بہت کم سن ہے، اس کا وزن بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ مارنے کے بجائے اگر اسے کسی اور جنگل کی طرف بھگا دیا جائے تو کیسا رہے؟''

بھائی صاحب کے لبوں پر یہ بات سن کر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی کہنے لگے:''کرنل صاحب آپ بھی تجربہ کار آدمی ہیں۔جنگلوں کی بو باس سے واقف ہیں۔سینکڑوں شیروں اور چیتوں کو ٹھکانے لگاچکے ہیں۔ میں بوڑھا آدمی، کج زبان، اب آپ سے کیا بحث کروں ...... لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ میری عمر بھی انہی جنگلوں کی آب و ہوا میں گزری ہے اور میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ جب بازوؤں کی ان مچھلیوں میں دَم تھا تو ہتھیار کے بغیر شیروں کے منہ میں ہاتھ ڈال دیتا تھا، اس درندے کی فطرت کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ بے شک یہ شیر قد میں بھی چھوٹا ہے اور وزن کا ہلکا

بھی، لیکن ہے بہت مکار اور ہوشیار۔ اگر مویشیوں پر اسی طرح ہاتھ صاف کرتا رہا تو بہت جلد گڈریوں اور پھر ندی سے پانی لانے والی عورتوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دے گا۔ میرے ہاتھ میں رعشہ ہے، بندوق چلا نہیں سکتا ورنہ خود اس کو گولی مارتا۔''

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی، لیکن شیر کہیں دکھائی نہ دیا۔ بھائی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ اتنا ہوشیار ہے کہ دن میں بستی کے آس پاس نہیں رہتا بلکہ دس پندرہ میل دور نکل جاتا ہے، لیکن رات ہونے پر آ جاتا ہے اور پچھلے پہر اکثر اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہم بستی میں واپس آئے۔ بھائی صاحب نے میرے لیے اپنی پالتو گائے کا دودھ گرم کیا۔ چائے پلائی اور پھر سبزی پکانے کی تیاری کرنے لگے۔ میں کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی بے خبر سو گیا۔ اگلے روز تڑکے ہی آنکھ کھل گئی۔ بھائی صاحب پوجا پاٹ سے فارغ ہو گئے تھے۔ میں نے بھی فجر کی نماز ادا کی، پھر بھائی صاحب کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینے لگا۔ اتنے میں وہ گڈریا بھی آ گیا جو گزشتہ روز ہمارے ساتھ جنگل میں گیا تھا۔ اس کی اتری ہوئی صورت دیکھتے ہی میں کھٹکا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے، بھائی صاحب کے استفسار پر اس نے بتایا کہ شام کے وقت جب کہ وہ مویشیوں کو لے کر بستی کی طرف آ رہا تھا کہ ایک شوخ گائے بھاگ نکلی، اس کا خیال تھا کہ گائے ادھر ادھر گھوم پھر کر واپس آ جائے گی، مگر وہ ابھی تک نہیں آئی۔ بھائی صاحب نے فکر مند ہو کر میری طرف دیکھا پھر گڈریے سے کہنے لگے:

''تو نے ہمیں اسی وقت کیوں نہ بتایا۔ رات بھی شیر بول رہا تھا۔ تیری گائے کو بھلا چیرے پھاڑے بغیر چھوڑا ہوگا؟'' میں نے گڈریے کو دلاسا دیا، پھر جلد جلد کپڑے پہنے رائفل سنبھالی اور گائے کو ڈھونڈنے کے ارادے سے چلا۔

میں اس مہم کو جتنا مشکل اور دشوار سمجھے ہوئے تھا، یہ اتنی ہی آسان اور سہل ثابت ہوئی۔ بستی کے مشرق میں صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سال کے درختوں کا جھنڈ تھا، گائے زخمی حالت میں وہاں پڑی تھی اور شیر سامنے ہی لمبی گھاس میں چھپا ہوا غرا رہا تھا۔ غالباً ہماری آمد سے چند منٹ پہلے ہی اس نے گائے کو دیکھا اور حملہ کیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو درختوں پر چڑھ جانے کا اشارہ کیا، پھر خود بھی ایک درخت پر چڑھا۔ یہاں سے مجھے شیر کی کھوپڑی صاف نظر آ رہی تھی اور اس سے پیشتر کہ وہ راہ فرار اختیار کرے، میری رائفل نے شعلہ اگلا اور گولی شیر کا بھیجا پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔

بستی کے لوگ جب خوشی خوشی اس کی لاش اٹھا کر لے جا رہے تھے تو کسی کو خبر نہ تھی کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

☆......☆......☆

بچو! کسی شہر میں ایک دھوبی رہتا تھا۔ دھوبی کے پاس ایک گدھا اور کتا تھا۔ دونوں میں خوب دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے برے وقتوں میں کام آتے۔ دوسرے تمام جانوران دونوں کی دوستی دیکھ کر رشک کرتے اور ہر جگہ ان دونوں کی دوستی کی مثال پیش کی جاتی۔

دھوبی صبح سویرے اٹھ کر گدھے پر کپڑوں کا گٹھر لاد کر ندی کے کنارے کپڑے دھونے چل دیتا۔ دھوبی کے گھاٹ پر پہنچ کر گدھے سے کپڑوں کا گٹھر اتار کر کپڑے دھونے میں لگ جاتا اور گدھے کو پاس ہی ندی کے کنارے چرنے کے واسطے چھوڑ دیتا۔ گدھا ندی کے کنارے اُگی ہری ہری گھاس چرتا اور جب پیٹ بھر جاتا تو کتے کے ساتھ کھیلتا۔ کتا بھی گدھے کے ساتھ اُچھل اُچھل کر خوب کھیلتا۔ کبھی کبھی اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر سواری بھی کرتا اور دیکھنے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

دوستی

قیصر زاہدی

ایک دن جب حسب معمول دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھونے میں مشغول تھا اس کا گدھا قریب ہی ہری ہری گھاس چر رہا تھا اور کتا گدھے کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک سانڈ وہاں پہنچ گیا۔ سانڈ نے جب گدھے کو ہری ہری نرم اور تر و تازہ گھاس کھاتے دیکھا تو اس کے منہ میں پانی آنے لگا۔ اس نے سوچا بھلا ایسی اچھی گھاس اور گدھا کھائے اسے تو صرف مجھے ہی کھانا چاہیے اور اس گدھے کو یہاں سے مار کر بھگا دینا چاہیے۔ چنانچہ یہ سوچ کر سانڈ تیزی سے گدھے کی جانب لپکا۔ مگر جیسے ہی وہ گدھے کی طرف بڑھا پیچھے سے کتے نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے بھنبھوڑنے لگا۔ کتے کے اچانک اس حملے سے سانڈ گھبرا گیا اور گدھے کو چھوڑ کر کتے کی طرف جھپٹا۔ مگر جیسے ہی وہ کتے پر جھپٹا گدھے نے بڑھ کر دولتی رسید کر دی۔ اب بے چارہ سانڈ بری طرح گھبرا گیا اور سوچا ان دونوں سے نمٹنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔ لہٰذا سانڈ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن جب سانڈ پھر آیا تو سانڈ کو دور سے ہی آتا دیکھ کر کتا غرایا اور گدھا بھی اپنے دونوں کان کھڑا کر کے سانڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں کو اس طرف تعینات اور تیار دیکھ کر سانڈ کو آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی اور وہ وہیں سے لوٹ گیا۔ جب سانڈ دونوں کو بالکل تیار دیکھ کر دور سے ہی لوٹ گیا تو گدھے نے اپنا منہ پھیلا کر کتے سے کہا

''دیکھا تم نے میں کتنا بہادر ہوں، سانڈ مجھے دیکھتے ہی ڈر کر بھاگ گیا اور یہاں آنے کی ہمت نہیں کی۔''

کتا بولا ''تم جھوٹ بولتے ہو وہ تمہیں دیکھ کر نہیں بھاگا بلکہ میرے غرانے کی آواز سن کر ڈر گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔'' گدھے نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تم سے زیادہ بڑا اور طاقتور ہوں مجھ سے ڈر کر ہی بھاگا ہے۔''

کتا اس کی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ بولا۔

''میں تم سے قد میں چھوٹا ضرور ہوں مگر تم سے زیادہ نڈر، بے خوف اور ہمت ور ہوں۔ وہ میرے تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں کو دیکھ کر بھاگا ہے۔'' دونوں ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ طاقتور اور بہادر ماننے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑ گئے اور اپنے کو ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ثابت کرنے کی کوشش کرتے کرتے آپس میں جھگڑ پڑے اور دونوں نے ایک دوسرے سے بات کرنی بند کر دی۔ اب دونوں گھاٹ پر آتے تو ایک دوسرے سے دور دور رہتے۔ کتا سوچتا جب گدھا مجھ سے بات نہیں کرتا تو میں خود اس سے بات کرنے کیوں جاؤں۔ اس سے بات کیے بغیر میرا کون سا نقصان ہو رہا ہے۔ اسی طرح گدھا بھی سوچتا کہ اگر کتا مجھ سے نہیں بولتا ہے تو میں اس سے بات کرنے کیوں جاؤں کیا میں اس سے کمزور اور کمتر ہوں۔ وہ نہیں بولتا ہے تو مت بولے اس کے بغیر میرا کون سا کام بگڑ رہا ہے۔

اب دونوں ندی کے کنارے آتے تو ایک دوسرے سے دور دور اور الگ الگ رہتے تھے۔ اب دونوں

ایک دوسرے کے ساتھ نہ کھیلتے کودتے اور نہ بات چیت ہی کرتے۔ گدھا چپ چاپ گھاس چرتا اور کتا کسی درخت کے سائے میں بیٹھا رہتا حالانکہ دونوں تنہائی محسوس کرتے۔ اسی طرح دو دن گزر گئے اور دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔

اتفاق سے تیسرے دن سانڈ وہاں پھر آ نکلا۔ جب سانڈ آیا تو اس نے دیکھا کہ آج گدھا اکیلے گھاس چر رہا ہے۔ کتا اس کے قریب نہیں ہے بلکہ دور ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ گدھے کو اکیلے دیکھ کر سانڈ کی ہمت بڑھی وہ گدھے کے بالکل قریب آ گیا۔ مگر پھر بھی کتا نہیں آیا بلکہ اطمینان سے دونوں پیروں کے بیچ منہ کر کے لیٹا رہا۔ سانڈ گدھے پر جھپٹا اور دو چار ڈھونس جما دیئے۔ بیچارہ گدھا اکیلے سانڈ سے کس طرح جیت سکتا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ کتا دور سے ہی بیٹھا سارا تماشا دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں خوب خوش ہو رہا تھا۔ جب گدھا بھاگ گیا تو سانڈ آرام سے ہری ہری گھاس کھاتا رہا۔ دوپہر کے وقت جب دھوبی کھانا کھا کر اٹھا تو اس کی بیوی نے حسب معمول بچا ہوا کھانا کتے کے آگے ڈال دیا۔ سانڈ نے جب کتے کو روٹی، چاول اور سبزی وغیرہ کھاتے دیکھا تو سوچا بھلا میں گھاس کھاؤں اور کتا روٹی، چاول اور مزے دار سبزیاں اڑائے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کتے کی طرف بڑھا۔ سانڈ کو اپنی جانب آتا دیکھ کر کتا غرایا مگر اس کے غرانے کا سانڈ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کتے کو اپنے سینگوں پر اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا۔ بے چارہ کتا دور جا گرا اور درد سے کراہنے لگا۔ پھر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ سانڈ پر حملہ آور ہو۔ گدھا دور سے کھڑا سارا تماشا دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں خوب خوش ہوا۔ پھر سانڈ کتے کا سارا کھانا کھا کر آرام سے چلتا بنا۔ اس طرح اس دن گدھے اور کتے دونوں ہی کو بھوکا گھر لوٹنا پڑا۔

اگلے دن سانڈ وہاں پھر آ پہنچا اور گدھے کو مار کر اس کی ساری گھاس کھا گیا اور پھر کتے کو بھی بھگا کر اس کا کھانا ہضم کر گیا اور دونوں بھوکے رہ گئے۔ اب دونوں دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ اگر اسی طرح ہم دونوں کے بیچ نااتفاقی بنی رہی تو یہ سانڈ روزانہ آ کر ہم لوگوں کا کھانا کھاتا رہے گا اور ہم دونوں کو بھوا ہی رہنا پڑے گا۔ دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور دونوں دل ہی دل میں اپنی غلطی پر نادم ہو رہے تھے۔

اگلے روز جب سانڈ وہاں پہنچا تو گدھے نے کتے کی جانب دیکھا اور کتے نے گدھے کی جانب۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ پھر تو جیسے ہی سانڈ گدھے کی طرف لپکا۔ کتا پیچھے سے سانڈ کو بھنبھوڑنے لگا۔ سانڈ گدھے کو چھوڑ کر کتے پر جھپٹا۔ اس کا کتے پر جھپٹنا تھا کہ گدھے نے اس پر کئی لاتیں رسید کر دیں۔ سانڈ بری طرح زخمی ہو گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دونوں دوست تمام گلے شکوے بھول کر اپنی اس فتح پر مسکرا اٹھے اور آئندہ پھر کبھی نہ لڑنے کی قسم کھائی۔

☆......☆

دفاع

سلطان محمود درانی

میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس دوران گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو محمد یاسر کو اپنا منتظر پایا۔ کہنے لگا ''کامران بھائی آج باہر کا موسم بہت سہانا ہے، آؤ ذرا باہر چہل قدمی کرتے ہیں۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی عدنان کو دروازہ بند کرنے کا کہا اور باہر نکل گیا۔

کامران آج تو ۶ ستمبر کا تاریخ ساز دن ہے، کیوں نہ ہم اپنے بزرگ فلائٹ لیفٹیننٹ (ر) محمد اکبر کی طرف چلیں، جو ہمارے ملک وقوم کے ہیرو اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ محمد یاسر کہنے لگا۔ بالکل چلتے ہیں تا کہ ہماری ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یادیں تازہ ہو جائیں۔ میں نے کہا۔

فلائٹ لیفٹیننٹ (ر) محمد اکبر ہمارے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر ہیں، ہم ان کے گھر کے پاس پہنچے تو وہ گھر کے باہر درخت کے نیچے کرسی پر

تشریف فرما تھے۔ ہم نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگے، آؤ بچو ان کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔ ہم نے بیٹھتے ہی کہا کہ آپ ہمیں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ان دو کارروائیوں کا احوال سنائیں، جس میں آپ بہ نفس نفیس شریک تھے۔

فلائٹ لیفٹیننٹ (ر) محمد اکبر کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ بچو! میں آپ کو چھ ستمبر کی صبح اپنی سب سے پہلی کارروائی جس کا آغاز نمبر ۱۹ اسکواڈرن کے چھ سیبر طیاروں کی پشاور سے پرواز سے ہوا، کا احوال سناتا ہوں، جس میں میرے ساتھ اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر، فلائٹ لیفٹیننٹ دلاور حسین، فلائٹ لیفٹیننٹ غنی اکبر، فلائنگ آفیسر خالد لطیف اور فلائنگ آفیسر ارشد چوہدری شامل تھے۔ ہمارے گروپ کی قیادت اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر کر رہے تھے۔

سیبر طیاروں کے پرواز کرنے کے کچھ ہی دیر بعد ایئر ڈیفنس کمانڈر کو بھارتی افواج کی لاہور کی طرف پیش قدمی کی اطلاع ملی، ہمارے گروپ کو واہگہ کی جانب تیزی سے بڑھتے ہوئے دشمن کے ٹینکوں کو روکنے کی ہدایت دی گئی۔ اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر نے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے ہمیں ٹینکوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، یہ حملہ کوئی بیس منٹ تک جاری رہا، جس کے بعد جرنیلی سڑک پر دشمن کے درجنوں ٹینک، بکتر بند گاڑیوں، جیپوں اور توپ خانے کے جلتے ہوئے ملبے کا ڈھیر لگ گیا۔

دوسرا کامیاب معرکہ بھی چھ ستمبر کو ہوا، جس میں بھارتی فضائیہ کے اڈے پٹھان کوٹ کو نشانہ بنایا گیا۔ پاکستانی اور بھارتی مورخوں اور مبصروں نے اسے تاریخ کا نہایت کامیاب معرکہ قرار دیا ہے۔ نمبر ۱۹ اسکواڈرن جوان دنوں پشاور میں مقیم تھا، کو بھارتی فضائیہ کے مشہور ہوائی اڈے پٹھان کوٹ پر حملے کا ہدف دیا گیا تھا، پٹھان کوٹ کا فاصلہ پشاور سے ۳۲۰ کلومیٹر ہے۔ نمبر ۱۹ اسکواڈرن کے اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر نے ہمیں اپنے ہدف پر کامیاب حملہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار کرلیا تھا، ہماری تیاری کچھ یوں تھی کہ پشاور سے پرواز کرنے کے بعد مخالف سمت کا رُخ کریں گے اور کچھ دیر بعد اچانک نیچی پرواز کرتے ہوئے اپنے ہدف کی جانب مڑ جائیں گے تاکہ دشمن کے ریڈار کی حد سے بچ سکیں۔

مجھ سمیت تمام پائلٹ چار بجے پٹھان کوٹ پر حملے کی بریفنگ کے لیے جمع ہوئے، حملے میں شریک ہونے والے پائلٹ دو گروپوں پر مشتمل تھے۔ پہلے گروپ میں اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر، فلائٹ لیفٹیننٹ دلاور حسین، فلائنگ آفیسر ارشد چوہدری اور فلائنگ آفیسر خالد لطیف شامل تھے۔ دوسرے گروپ میں میرے علاوہ فلائٹ

لیفٹیننٹ غنی اکبر اور فلائنگ آفیسر عباس خٹک شامل تھے، ونگ کمانڈر تواب اور فلائٹ لیفٹیننٹ ارشد سمیع خان کو دستے کے محافظ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

دس سیبر طیارے پٹھان کوٹ پر حملے کی غرض سے ساڑھے چار بجے پرواز کر گئے، تمام کاروائی منصوبے کے مطابق ہو رہی تھی۔ پاک فضائیہ کے سیبر طیارے شام پانچ بج کر پانچ منٹ پر اپنے ہدف پر پہنچ گئے، ہم یہ دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے کہ پٹھان کوٹ کا ہوائی اڈا دشمن کے طیاروں سے بھرا پڑا تھا، جن میں جدید قسم کے مگ ۲۱ فائٹر طیارے بھی شامل تھے۔اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر کے طیارے کو پانچ سو میٹر کی بلندی سے غوطہ لگاتے ہوئے دشمن کے جہازوں کا نشانہ لے کر جہاز کے توپوں کے دہانے کھول دیے، ہر پائلٹ کو صرف دو حملے کی اجازت تھی، لیکن شاندار شکار کو دیکھ کر ہر ایک نے چار حملے کیے، ہمارے طیارے اپنا حملہ پورا کرکے واپس آ گئے۔ بھارتی طیارہ شکن توپیں ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں۔ پاک فضائیہ کا یہ کلاسیکی حملہ تھا، جس میں بھارتی فضائیہ کے بائیس طیارے تباہ ہوئے۔اس کامیاب حملے پر مجھ سمیت چھ پائلٹوں کو ستارہ جرات سے نوازا گیا۔ جن میں اسکواڈرن لیڈر سجاد حیدر، فلائٹ لیفٹیننٹ دلاور حسین، فلائٹ لیفٹیننٹ غنی اکبر، فلائٹ لیفٹیننٹ ارشد سمیع خان اور ونگ کمانڈر تواب شامل ہیں۔

میرے بچو! اس جنگ میں عالمی سطح پر بھی ہماری صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا، لندن سے شائع ہونے والا جریدہ ''سنڈے ٹائمز'' ۱۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ

''پاکستان کی فضائیہ بھارتی جہازوں کو مار بھگا کر اور درست ہدف بنانے کے بعد مکمل فضائی تسلط حاصل کرنے کے قابل ہو گئی تھی، بھارتی پائلٹ پاکستانی پائلٹوں اور افسروں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار تھے اور ان کی قیادت قابل صد افسوس تھی۔ بھارت مکمل طور پر اس قوم کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہو چکا تھا، جس کا آبادی کے لحاظ سے تناسب ایک اور چار اور مسلح افواج کی جسامت کے لحاظ سے ایک اور تین کا تھا۔

ہم بھی اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد افواج پاکستان میں اپنی خدمات سرانجام دیں گے، یہ ہمارا آپ سے وعدہ ہے، میں نے اور محمد یاسر نے مل کر کہا۔

شاباش میرے بچو! اس ملک و ملت کو اب آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے، جو وطن کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے ملک کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

☆......☆

ایک انار سو بیمار

سمعیہ غفار

دین محمد موچی تھا اس نے اپنے گاؤں میں اپنی ایمان داری، دیانتداری اور خوش اخلاقی سے اچھی خاصی عزت کمالی تھی۔گاؤں کے تمام لوگ اسے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے،اوراس کی خوش اخلاقی سے اتنے متاثر تھے کہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔دین محمد اتنا کمالیتا تھا کہ اپنے بچوں کوعزت سے دو وقت کی روٹی کھلا سکے اور سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رہ سکے۔اس نے کبھی اپنی ضرورت کیلئے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔بلکہ وہ ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے والی بات پرعمل کرتا تھا۔اس کے چار بیٹے تھے۔کیونکہ دین محمد غریب تھا اور اپنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا تھا۔لہٰذا گاؤں کے ماسٹر صاحب دین محمد کی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر اس کے بچوں کو مفت تعلیم دیا کرتے تھے۔یوں دین محمد مطمئن تھا کہ اس کے بچوں کو تعلیم مل رہی ہے۔اور وہ ایک نہ ایک دن اچھے انسان اور بڑے آدمی بن جائیں گے۔

ایک روز دین محمد کا سب سے چھوٹا بیٹا بیمار ہو گیا۔اسے بہت تیز بخار ہو گیا۔دین محمد نے گاؤں کے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا جو حکیم بھی تھے اور دواؤں اور جڑی بوٹیوں دونوں سے علاج کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے بچے کا ہر طریقہ سے علاج کر کے دیکھ لیا۔لیکن اسے کوئی فرق نہ پڑا اور بچے کا بخار نہ اترا۔دین محمد بیچارا بہت پریشان ہوا کہ اب وہ کیا کرے۔کہاں سے بچے کا علاج کرائے اس کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ شہر جا کر بچے کا علاج کرا سکے۔اُدھر ڈاکٹر صاحب بھی پریشان تھے کہ آخر اس بچے کا علاج کس طرح سے ممکن ہے۔انہوں نے اپنی زندگی میں اس نوعیت کا پہلا کیس دیکھا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا تو کسی نے ان کو بتایا کہ ان کے پاس بھی اسی طرح کا ایک کیس آیا تھا جو اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ان سے علاج کا طریقہ دریافت کیا اور دین محمد کو بلا کر کہا کہ دیکھو دین محمد تمہارا بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا بس تمہیں اسے انار لا کر کھلانا ہو گا، پھر دیکھو کیسے بخار اترتا ہے۔دین محمد ایک طرف خوش تھا دوسری طرف پریشان کیونکہ انار کا موسم جا چکا تھا، اور اس موسم میں اس کیلئے انار حاصل کرنا ناممکن تھا۔بہر حال اس نے کوشش کی اور اپنے دوستوں رشتہ داروں سے کہہ دیا کہ اگر کہیں سے انار کا بندوبست ہو سکتا ہے تو اس کیلئے کریں۔انار کی تلاش کرتے کرتے بالاخر اسے انار مل گیا۔لیکن بہت مہنگا ملا کیونکہ انار کا موسم تو ختم ہو چکا تھا۔بہر حال وہ انار لے کر گھر گیا اور اس کے تینوں بڑے بچوں نے جب یہ سنا کہ ان کا چھوٹا بھائی انار کھانے سے ٹھیک ہو گا تو ان کا دل بھی للچایا کہ وہ بھی بن موسم انار کھائیں لہٰذا انہوں نے بھی بہانہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ بیمار ہیں تا کہ ان کو انار مل سکے۔دین محمد جب گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے باقی بچے بھی لائن سے لیٹے ہوئے ہیں اور تکلیف سے کراہ رہے ہیں۔دین محمد پریشان ہو گیا کہ اس کے پاس تو صرف ایک ہی انار ہے، وہ کس کس کو کھلائے گا۔دین محمد ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ڈاکٹر صاحب اپنے آدمی اور سامان کے ساتھ اس کے گھر پہنچے اور بچوں کا معائنہ کیا۔وہ سمجھ گئے کہ باقی بچے انار کھانے کے چکر میں بیماری کا بہانہ کر رہے ہیں۔انہوں نے دین محمد سے کہا کہ تم انار تو چھوٹے بچے کو کھلاؤ باقی بچوں کو تو کوئی اور بیماری ہے، میں ان کا علاج کرتا ہوں۔یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے تین انجیکشن تیار کیے۔انجکشن دیکھ کر بچے ڈر گئے اور بھاگنے لگے لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی نے انہیں بھاگنے نہ دیا اور انجکشن لگا دئے۔اس پر بچے خوب چلائے اور چیخنے لگے کہ ہمیں معاف کر دیں ہم آئندہ نہیں کریں گے۔ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور دین محمد کو ان کے بہانے سے آگاہ کیا اور کہا کہ آپ فکر نہ کریں ان کو صرف سبق سکھانے کیلئے پانی سے بھرے انجیکشن لگائے ہیں۔تا کہ یہ آئندہ اس طرح کی حرکت نہ کریں۔دین محمد کا بچہ انار کھاتے ہی تندرست ہو گیا۔دین محمد نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے اسے کہتے ہیں ’ایک انار سو بیمار‘ اور کلینک کی جانب چل پڑے۔ ●●

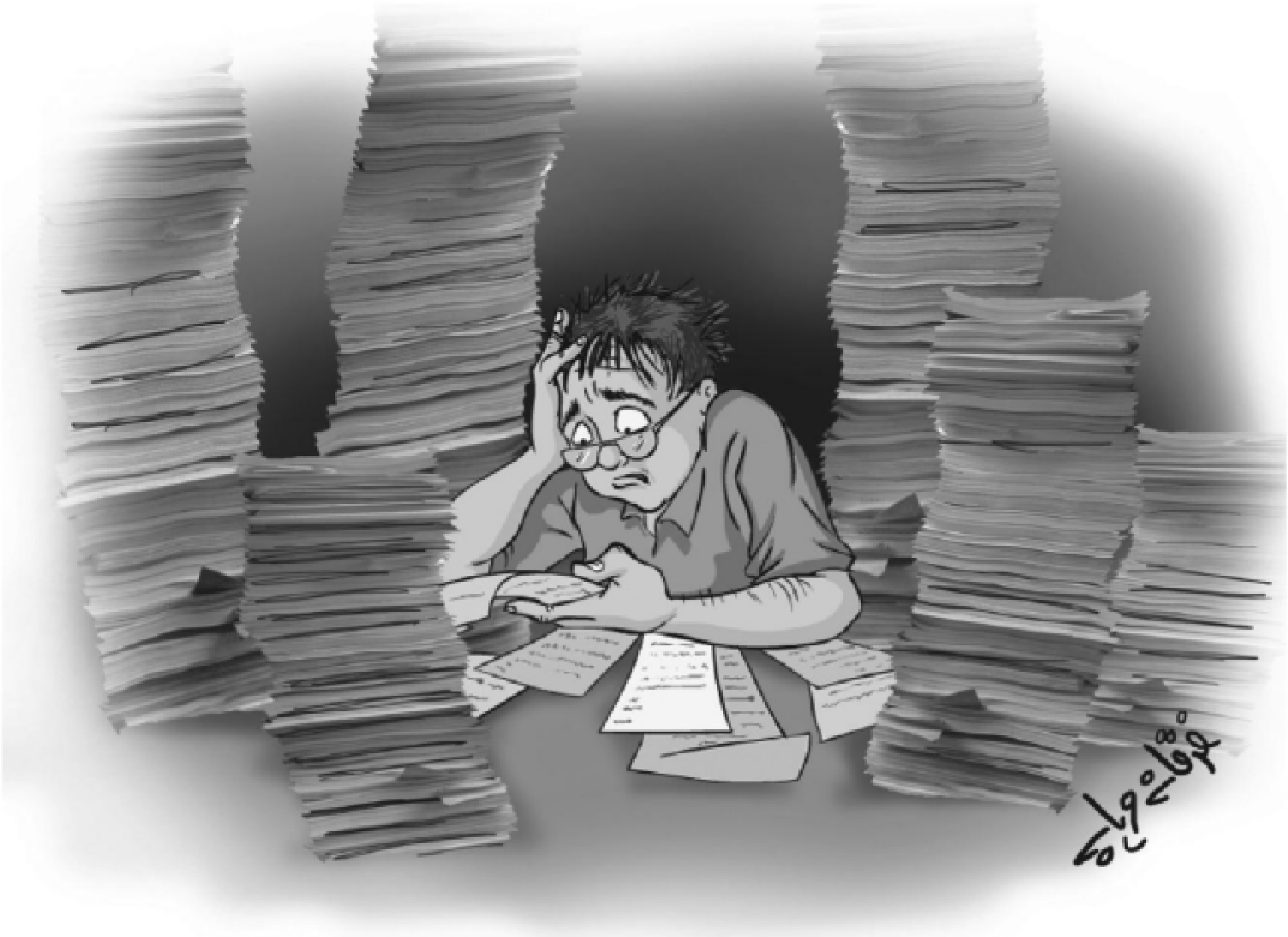

کھٹے میٹھے خط

عدنان مجید مختصر اور جامع تبصرہ کرتے ہیں

نومبر کا ساتھی دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ سرورق پر بنا ہوا بچہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے والدین کو شکریہ کہہ رہا ہو۔ قرآن محفل، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد''، ''میرے نبیؐ کے دیس میں'' اور ''حج اکبر'' سمیت تمام کہانیاں اور سلسلے اچھے لگے۔ میری طرف سے تمام ساتھیوں کو نیا سال مبارک۔

سندھ کے شہر حیدرآباد سے **محمد جبال سردار** لکھتے ہیں

نومبر کا ساتھی بہت جلدی مل گیا، پڑھ کر بہت ہی مزہ آیا۔ سبھی تحریریں شاندار تھیں لیکن نوشاد عادل کی ''حج اکبر''، کاشف شفیع کی ''میرے نبیؐ کے دیس میں'' اور شام درانی کی نظم ''ہے امتحان سر پر'' دل کو چھو گئیں۔ مستقل سلسلے میں قرآن محفل، کوچہ اشعار، ایک شہر ایک صفحہ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار تھے۔ مجھے ساتھی پڑھنا بہت پسند ہے اور ہر ماہ کے آغاز ہوتے ہی رسالے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ امید ہے میرا خط ضرور شائع ہوگا۔ اب تو بتا دیجئے کے جوابات بھیج رہا ہوں۔ دعا کرتا ہوں میرے جوابات درست ہوں اور مجھے انعام ضرور ملے۔

طوبیٰ جاوید اقبال غم کے سمندر میں غوطہ زن نظر آرہی ہیں

جس طرح پچھلی دفعہ رسالے میں انعام (سندباد کا مفت سفر) وغیرہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی اسی طرح اس بار رسالہ دیکھ کر غم کے گہرے سمندر میں غرق ہوگئی۔ پھر ذرا ہوش کے کنارے پر پہنچی تو یہ معلوم ہوا کہ یہ اپنا ساتھی رسالہ ہے جس نے نہ صرف ہماری تحریریں وغیرہ رڈی کی ٹوکری کی

نذر کر دیں بلکہ ہمارا نام اور خط تک شائع نہ کیا۔ پھر جب رسالہ پڑھا تو آخر کار قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ دل تو راضی نہ تھا۔ لیکن ہم نے یہ کہہ کر دل کو منا لیا کہ اس بار شائع نہ ہوا تو اگلی بار تو ضرور شائع ہوگا۔ لیکن اگر اس بار بھی ہمارا خط، نام اور تحریریں وغیرہ شائع نہ ہوئیں تو......

......آپ کی خواہش کے کیا کہنے؟......اگر ہر ماہ آپ کو ہی ترجیح دی جائے گی تو پھر دوسرے قارئین کی وہی حالت ہوگی جیسی ابھی آپ کی ہے۔ حوصلہ رکھیں اور کوشش جاری رکھیں۔

خولہ عبدالنعیم کا دھمکی آمیز خط ہمارے ہاتھوں میں آچکا ہے

ساتھی کی محفل میں بہت دفعہ قدم رکھ چکی ہوں، ساتھی میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ مجھے ساتھی والوں سے شکایت ہے کہ وہ ہماری کہانی یا کوئی نظم وغیرہ کیوں شائع نہیں کرتے۔ اگر آپ نے ہمارے اقوال زریں شائع نہیں کیے تو آئندہ سے ہم نہ ساتھی پڑھیں گے اور نہ کچھ ساتھی میں لکھیں گے۔

......اگر BMW گاڑی میں آپ ڈیزل یا عام سا پیٹرول ڈال دیں تو وہ صحیح طرح نہیں چل سکے گی۔ ساتھی کی اچھی صحت کا بھی یہی راز ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں معیاری تحریریں لکھنے کے لیے کوشش جاری رکھیں۔

رضوانہ ناز، کراچی سے لکھتی ہیں

بچوں کا پسندیدہ رسالہ ساتھی میرا بھی پسندیدہ رسالہ ہے۔ ''موت کا راستہ'' ناول (اشتیاق احمد) بہت ہی اچھا ناول ہے اور ''حج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''مسکرایئے ناں'' بہت زبردست چل رہا ہے۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ ساتھی بلاشبہ ایک بہت معیاری اور اردو ادب کا ایک بہترین رسالہ ہے۔

محترم افق دہلوی بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں

ساتھی کا سرورق بہت دل ربا اور مواد پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کے لیے بچے اور بڑے بڑی محنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھ سمیت تمام کے قلم میں عطا فرمائے۔

محمد ابراہیم، شبیر، عبدالفتاح اور امجد علی ڈیرہ مراد جمالی سے لکھتے ہیں

نومبر کا ساتھی بہت دیر سے ملا۔ روز روز دکانوں کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ آخر جب رسالہ ہاتھ آیا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اتفاق سے ہم کو صرف ایک ساتھی ملا۔ اب ہم لوگوں میں یہ مشورہ ہوا کہ پہلے کون پڑھے۔ بالآخر باری باری سب نے پڑھا۔ ''حج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' (اشتیاق احمد)، ''میرے نبیؐ کے دیس میں'' (کاشف شفیع) بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہم بھی کبھی پیارے نبیؐ کا دیس دیکھیں۔

......ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو قبول فرمائے۔ (آمین)

نائلہ صدیقی کچھ تاخیر سے تشریف لائیں ہیں

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ امید ہے خاص نمبر کی تیاری زور و شور سے جاری ہوگی اور بہت اچھی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو ہمت عطا فرمائے اور آپ کی کاوشوں کو قبولیت بخشے۔

یاسر اکرم ساتھی پر تبصرہ کرتے ہیں

ساتھی کا سرورق خوشگوار موسم کا احساس دلا رہا تھا۔ ''ایک شہر ایک صفحہ'' معلومات پر مبنی تھا۔ ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' (شازیہ فرحین)، ''میرے

نبیؐ کے دیس میں'' (کاشف شفیع)، ''صاف راستہ'' (عظمیٰ تسنیم) بہت زبردست تھی۔ ''آمنہ کی قربانی'' (فریحہ کمال) تحریر کا انداز بیان بہت لاجواب تھا۔ اس کے علاوہ تحریریں بھی لاجواب تھیں۔ ''تانک پورہ کا مستانہ'' (ش کاظمی) شاندار تجسس کی حامل قرار پائی۔ ''مظاہرہ'' (اعظم طارق کوہستانی) اچھی لگی۔ اس کے علاوہ ''گھوڑے کا روزنامچہ''، ''مہربان اجنبی''، ''مجھ سے ملئے''، ''ہمت مرداں''، ''تعبیر'' اور ''سرخ لائٹ'' بھی قابلِ تعریف تحاریر تھیں۔ جبکہ نظموں میں ''کیا تم گنتی کر سکتے ہو'' اور ''ایک بکرا لائیے'' نے دل جیت لیا۔

✉ محمد علی بیگ اپنے خط میں لکھتے ہیں

نومبر کا شمارہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ ''حج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' (شازیہ فرحین)، ''صاف راستہ'' (عظمیٰ تسنیم) اور ''آمنہ کی قربانی'' (فریحہ کمال) بہترین تحریریں تھیں۔ قسط وار سنسنی خیز ناول ''موت کا راستہ'' (اشتیاق احمد) کی چوتھی قسط اچھی تھی۔ برائے مہربانی ذرا ہر ماہ کی قسط چھ سے سات صفحات میں دیا کریں۔ نظموں میں ''ایک بکرا لائیے'' (عبدالقادر) پسند آئی۔ ساتھی کی خدمت میں ایک کہانی پیش ہے۔ امید ہے کہ شائع کریں گے۔

▶ ......کہانی کے حوالے سے وہی بات جو ہم سب سے کہتے ہیں کہ معیاری ہوگی تو لازماً قابلِ اشاعت ہوگی۔ ناامید نہ ہوں انسان مشق کرنے سے سیکھتا ہے۔

✉ میڈیکل کالج کی طالبہ فرحین اقبال راؤ لاہور سے تشریف فرما ہیں

نجانے کیسے ہمارے گھر میں ۲۰۰۸ کا ساتھی آن وارد ہوا۔ نہایت دلچسپ، مزیدار اور اصلاحی لگا۔ پہلی دفعہ پڑھا تھا اور بہت اچھا لگا۔ لہٰذا اس بزم ساتھی میں ہم نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ایک تحریر حاضر خدمت ہے امید ہے کہ شرف قبولیت بخشیں گے۔

▶ ......اپنی تحریر بھیجتے وقت اس بات کا خیال رکھا کریں کہ تحریر کے اختتام پر واضح انداز میں آپ کا نام، پتہ، فون نمبر اور ای میل موجود ہے یا نہیں۔

✉ حمزہ حفیظ، ہیڈ راجکاں سے لکھتے ہیں

اس دفعہ کا شمارہ کچھ خاص نہ تھا۔ سرورق بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس شمارے میں ''حج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' (شازیہ فرحین)، ''آمنہ کی قربانی'' (فریحہ کمال) اور ''گھوڑے کا روزنامچہ'' (جاوید بسام) خوبصورت تھیں۔ نظموں میں ''کیا تم گنتی کر سکتے ہو؟'' اور ''ایک بکرا لائیے'' اچھی لگیں۔ ''ایک شہر ایک صفحہ'' کی سیر کر کے بہت مزا آیا۔ اس کے علاوہ مختصر + دلچسپ بہت خوبصورت تھا۔ اس مرتبہ آپ سے تصویری کہانی شائع کی ہی نہیں۔ میں تصویری کہانی بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

▶ ......جب تمام چیزیں ہی خوبصورت اور اچھی لگیں تو پھر شمارہ کیوں نہیں خاص لگا؟

✉ عبدالمتین زہری کیا کہتے ہیں دیکھتے ہیں

اس ماہ کا ساتھی بہت اچھا تھا اور بہت جلد موصول ہوا۔ ''حج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''مہربان اجنبی'' (وقار محسن)، ''ہمت مرداں (ذیشان صفدر)، ''آمنہ کی قربانی'' (فریحہ کمال) کہانیاں بہت اچھی تھیں اور نظموں میں ''ایک بکرا لائیے (عبدالقادر)، ''ہے امتحان سر پر'' (شام درانی) بہت اچھی تھی اور مستقل سلسلے میں ''ایک شہر ایک صفحہ''، ''مسکرایئے ناں'' اور ''مختصر + دلچسپ'' بہت اچھے تھے۔ پڑھ کے بہت مزا آیا۔ رسالے میں کھیلوں کی دنیا بھی شامل کریں۔

✉ سمیرا امیر بھی ساتھی کی محفل میں آن پہنچی ہے۔

سب سے پہلے تمام قارئین، مصنفین اور ساتھی کی پوری ٹیم کو عید مبارک۔ ویسے تو اب عید کو گزرے دو ماہ ہو چکے لیکن پھر بھی جس وقت یہ خط لکھا

جا رہا ہے وہ عید کا دوسرا دن ہے۔ جبھی مبارکباد دینا فرض بنتا ہے۔ ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ ساتھی کے سرورق پر بکرا بنا تھا یا دنبہ؟ خیر جو بھی تھا ہمیں اس سے کیا ساتھی نے قربانی تو کی۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھی۔ (اب اگر میں دو چار کی تعریف کروں گی تو دیگر کا منہ بن جائے گا)، ''موت کا راستہ'' نے تجسس پھیلایا ہوا ہے۔ وہ اشتیاق احمد صاحب ہی کیا جو تجسس بھرے ناول نہ لکھیں۔ خطوط کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ بھئی میں تو سب سے پہلے خطوط ہی پڑھتی ہوں۔ خطوط میں نگینہ امیر کا خط اچھا لگا۔ (اف کیا کروں یہ بات مجھ سے سر پر پستول رکھ کر لکھوائی جا رہی ہے) نظموں میں تو ہمیشہ ہی عبدالقادر صاحب کی نظمیں بازی لے جاتی ہے۔ ویسے آج کل قمر ناز دہلوی ساتھی میں نظر نہیں آ رہے۔ ''راز کی بات بتاؤں؟ آج کل وہ ''اخبار جہاں'' میں پائے جاتے ہیں۔ بھئی اب مجھے چغل خور مت سمجھ لیجئے گا۔ اب مجھے سالنامے کا انتظار ہے۔ آخر کب آئے گا؟ ویسے آپ کو احساس ہو جانا چاہیے۔ ہماری اور ساتھی کی دوستی۔ یہی وجہ ہے کہ عید کے دوسرے دن ہی خط لکھنا شروع کر دیا۔

بہاولپور سے فرید حسین لکھتے ہیں

نومبر کے شمارہ میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میں ہر مہینے ساتھی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ میں نے یہ خط ہمت سے لکھا ہے۔ اس میں خاص طور پر ''موت کا راستہ'' (اشتیاق احمد)، ''ہمت مرداں'' اور ''مختصر + دلچسپ'' بھی اچھی لگیں۔ مہربانی کر کے اگلا شمارہ تھوڑا سا سستا کر دیں کیونکہ ہم جیب خرچ اکٹھا کر کے یہ خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ لطیفے بھی بہت اچھے تھے۔

......آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ ہمیں کہیں سے سستے داموں کاغذ دلوا دیں اور کم قیمت پر چھپائی کروا دیں۔

محمد ناصر اکرم لکھتے ہیں

قرآن محفل نے دل کی گہرائیوں میں جگہ بنالی۔ السلام علیکم ایک عظیم سبق سے آشنا کرا گیا۔ ''حج اکبر'' (نوشاد عادل) پڑھ کر عجیب سی مسرت ہوئی۔ ''موت کا راستہ'' (اشتیاق احمد) زبردست ہے لیکن الفاظ بہت گڈمڈ ہوتے ہیں۔ ایک شہر ایک صفحہ معلومات میں اضافہ کا سبب بنا۔ ''میرے نبیؐ کے دیس میں'' (کاشف شفیع) سفر حجاز کی روداد نے خواب جیسا منظر پیش کیا۔ (سبحان اللہ)۔ ''مجھ سے ملئے'' (محمد علی) جاندار تھی۔ ''صاف راستہ'' (عظمیٰ تسنیم) کے کیا کہنے۔ ''آمنہ کی قربانی'' (فریحہ کمال) عید قرباں کی حوالے سے زبردست کاوش تھی۔ ''تعبیر'' (غلام محی الدین ترک) کچھ پرانے آئیڈیاز پر مشتمل تھی۔ ''گھوڑے کا روزنامچہ'' (جاوید بسام) بازی لے گئی۔ ''سرخ لائٹ'' (میر شاہد حسین) آپ لوگوں نے ایک حساس موضوع کو جگہ دی۔ مختصر + دلچسپ تمام قابل ستائش تھیں۔ نظموں میں ''ایک بکرا لائیے'' (عبدالقادر) لذیذ روایتی کھانوں کی طرح تھی۔ امیر سسٹرز پھولے نہیں سماتیں انہیں پتا ہونا چاہیے سیر پر سوا سیر بھی ہوتا ہے۔ ارے ارے ناراض ہو گئیں کیا...... مذاق کر رہا تھا۔ اللہ کرے ہم سب کا زور قلم اور زیادہ ہو جائے۔

اویس شفیق اس دفعہ اپنے خاندان کی نمائندگی کر رہے ہیں، لکھتے ہیں

نومبر کا شمارہ عیدالاضحیٰ کے بعد ملا۔ سرورق دیکھ کر خوشی ہوئی کیونکہ جانور کو مسکراتے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ قرآن محفل اور السلام علیکم نے ہمارے دلوں پر بڑا اثر کیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ناول زبردست جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ علامہ اقبال پر مضمون کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور اقبال کوئز کو ہم نے بہت یاد کیا اگر اس دفعہ بھی اسی طرح کا کوئی انعامی مقابلہ کرواتے تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ انعامی مقابلہ ہوتا بغیر انعام کے مقابلہ کرواتے اس طرح علامہ اقبال کا دیوان پڑھنے کو مل جاتا ہمیں (اس بہانے) سیالکوٹ کے بارے میں معلومات اچھی لگیں۔ علامہ اقبال کا مزار اور اقبال منزل کی تصویر بھی بہت اچھی تھیں۔ اقبال پارک کی تصویر بڑی ہونی چاہیے تھی۔ مجھے پھر ایک شکایت ہے ہر دفعہ سندباد کا سفر کا ٹوکن کے پیچھے کہانی ہوتی ہے اس دفعہ ناول کاٹ کر بھیجنا پڑا ہمارا رسالہ خراب ہو جاتا ہے برائے مہربانی اشتہار پیچھے لگایا کریں۔ گھوڑے کا روزنامچہ اور نظمیں بھی اچھی تھیں۔ اس ماہ مختصر + دلچسپ زبردست تھا۔ اقبال کا شاہین اور گہری سازش

زبردست تھی۔اور کھٹے میٹھے خط کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔

عروبہ امتیاز خان لکھتی ہیں

اس دفعہ کا رسالہ بہترین تھا۔ہر کہانی اچھی سے اچھی تھی۔خاص طور پر ''جج اکبر''، ''مہربان اجنبی''، ''سرخ لائٹ'' اور ''مظاہرہ''۔اچھا یہ بتائیں کہ جو سفرنامہ شائع ہوا ہے ''میرے نبیؐ کے دیس میں'' کی شروع کی لائن میں آپ نے شوق کو شوخ لکھا ہوا ہے۔دوسری بات یہ کہ آپ نے میرے خط میں حافظ لکھا ہوا ہے نا کہ میں حافظ ہوں۔تیسری بات یہ کہ آپ نے علامہ اقبال کے شہر کے علاوہ کوئی اور معلومات شائع نہیں کیں اور چوتھی بات یہ کہ آپ پلیز یہ بھی بتادیں کہ سندباد میں پروگرام کب ہوگا ورنہ ہمیں رسالہ دیر سے ملا تو کیا ہوگا؟

……غلطیوں پر توجہ دلانے کا شکریہ۔علامہ اقبال کے حوالے سے اگر مزید معلومات دی جاتی تو پھر آپ یہ کہتی کہ نومبر کے شمارے میں اقبال کی معلومات کے سوا کچھ نہ تھے۔

عاقب اور شاہد ہیڈ راجکاں سے رقمطراز ہیں

اس مرتبہ رسالہ بس گزارے لائق تھا۔پڑھ کر اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ رسالہ پڑھ کر آتا تھا۔اس مرتبہ کی کہانیاں جو ہمیں کچھ اچھی لگیں، ''جج اکبر'' (نوشاد عادل)، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' (شازیہ فرحین)، ''مہربان اجنبی'' (وقار محسن) اور ''گھوڑے کا روزنامچہ'' (جاوید بسام) تھیں۔اس کے علاوہ لطیفے بھی پسند نہیں آئے۔اس رسالے کی سب سے اچھی بات وہ اس کا سرورق تھا۔انکل فکری کے سائنسی تجربے دلچسپ نہیں ہوتے۔پلیز کوئی نیا سلسلہ شروع کریں۔اس مرتبہ آپ نے تصویری کہانی شائع نہیں کی مگر مجھے امید ہے کہ اگلی مرتبہ آپ ضرور شائع کریں گے۔

فہد اظہر، بہاولپور سے لکھتے ہیں

شمارہ نومبر اس دفعہ مجھے ملا ہی نہیں لیکن پھر بھی خط لکھ رہا ہوں۔اس دفعہ میں نے اپنے دوست سے ایک دن کے لیے لیا تھا لیکن کیا کہنے شروع میں سرورق کا تو بس گزارا ہی کیا تھا کوئی خاص نہیں تھا۔لیکن پھر سوچا کہ کہانیوں پر آپ نے محنت کی ہوگی۔پہلے تو دل نے کہا کہ رہنے دوں لیکن پھر رہا نہیں گیا۔مجھے تو صرف دو کہانیاں اس میں اچھی لگیں۔پہلی تو ''تانک پور کا مستانہ'' دوسری ''گھوڑے کا روزنامچہ'' ویسے میرا انعام آپ نے ابھی تک نہیں بھیجا جو نکلا تھا۔آپ کو ہم ہر مرتبہ کہتے ہیں کہ رسالہ سستا کردیں مگر سنتے ہی نہیں ایک تو رسالہ سستا نہیں کرتے اور دوسرا اشتہارات دے دیتے ہیں۔کہانیوں کے لیے ورق تھوڑے ہوجاتے ہیں۔یہ خط شائع ضرور کریں کیونکہ اس دفعہ بڑی محنت سے آپ کی خامیاں نکالیں ہیں۔''اب تو بتا دیجیے'' میں جو آپ سوال بھیجتے ہیں ہم نے کہا تھا کہ آسان بھیجا کریں تو آپ نے انہیں اور مشکل کردیا۔

……آپ نے اتنی محنت کرکے اتنی سی خامیاں نکالیں جبکہ بغیر محنت کیے آپ نے اتنی ساری خوبیاں بھی بیان کردیں۔کیوں؟؟

طوبیٰ جاوید اقبال خون کے آنسو بہاتی ہوئی داخل ہو رہی ہیں

نومبر کا شمارہ دیکھا تو ایک بار پھر دل خون کے آنسو رودیا، کیونکہ رسالے میں نہ تو ہمارا خط شائع ہوا تھا اور نہ ہی کوئی اور تحریر پلیز آج تو آپ ہمیں بتا ہی دیجیے کہ ہم سے کیا دشمنی ہے؟ سرورق تو بہت خوب تھا۔کہانیاں تو سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔جن میں ''جج اکبر''، ''صاف راستہ''، ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' اور ''مظاہرہ'' بازی لیں گئی اور نظموں میں ''ایک بکرا لائیے'' بہت زبردست تھی۔''انکل فکری کے سائنسی تجربے بہت زبردست ہوتے ہیں۔میں ہمیشہ ان کو عملی طور پر کرکے بھی دیکھتی ہوں کیونکہ مجھے سائنس سے بہت دلچسپی ہے۔اس بار ہمارے امتحان ہو رہے ہیں۔آپ ضرور دعا کیجیے گا کہ اوّل پوزیشن لے کر سرخرو ہوجاؤں۔

……آمین

☆……☆

مُختصر + دِلچسپ

صبح کا بھولا

فرحین اقبال راؤ

''ہوں! نہیں پڑھنا میں نے سارا دن...... بس پڑھنا پڑھنا۔ خود تو پڑھا نہیں اور ہم پر پڑھنے کا عذاب ڈال دیا ہے۔'' فہد جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اونچی آواز میں چیختا ہوا اپنے بہن بھائیوں کے مشترکہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا لہجہ نہایت غیر مناسب تھا جب ہی باورچی خانے میں سے امی جان نکل کر آئیں۔

''فہد! یہ کیا طریقہ ہے، نہ سلام نہ دعا؟ آتے ہی طوفان بدتمیزی برپا کر دیا ہے؟'' امی جان کے انداز میں برہمی تھی۔ مگر فہد ان کو بھی خاطر میں نہ لایا۔

''سن لیجیے...... مجھے نہیں پڑھنا! اگر مجھ سے واقعی آپ لوگوں کو خصوصاً ابا حضور کو محبت ہے تو مجھے ان کتابوں کے جنجال میں مت ڈالیں۔ مجھے نفرت ہے ان کتابوں سے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انگلش گرامر کی کتاب ایک طرف

اچھال دی۔
''اس سے بہتر ہے کہ میں کہیں نوکری کرلوں!!
فہد نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا اور جا کر دھم سے بستر پر گر گیا۔ امی، باجی اور چھوٹا علی بس اس کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

فہد آٹھویں جماعت کا ہونہار طالب علم تھا۔ ساتویں تک وہ بڑا دل لگا کر پڑھتا تھا۔ والدین کا فرمانبردار اور گھر کے کام کاج میں سب کی مدد کرنے والا تھا۔ آٹھویں میں آیا تو جماعت میں کچھ نئے طلبہ بھی داخل ہوئے جو پڑھائی سے بیزار قسم کے لڑکے اور ویڈیو گیمز کے شوقین تھے۔ نجانے کیسے فہد رفتہ رفتہ ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگ گیا۔ وہ سب امیر زادے تھے جو پیسوں کے بل پر کام نکلواتے۔ مگر فہد کا تعلق ایک متوسط درجے سے تھا۔ اس کے والد کی کپڑوں کی دکان تھی اور وہ اپنے بچوں کو حلال رزق میں بس مشکل سے ہی پڑھا رہے تھے۔ اب جب کہ فہد ان امیر زادوں کے ہمراہ ہوا تو پہلے تو اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوا۔ وہ ہونہار سے درمیانے درجے کا طالب علم بنا۔ پھر یہ ہوا کہ ویڈیو گیمز اور جاسوسی اور بے مقصد ناولوں کا چسکا اسے بھی لگ گیا اور وہ مکمل طور پر زیرو ہو گیا۔ اکثر وہ آنکھ بچا کر اسکول کے بجائے ویڈیو گیمز کی دکان پر جا پہنچتا۔ مگر اس کے بورڈ کے امتحانات قریب آرہے تھے لہٰذا اس کے والد نے بہت تگ و دو کر کے اس کے لیے ٹیوشن کا بندوبست کیا اور ساتھ ہی ہر قسم کی تفریحی سرگرمی پر پابندی لگا دی۔ فہد جو کہ ویڈیو گیمز کا شوقین ہو چکا تھا وہ کیسے چھوڑتا سب کچھ؟ لہٰذا اسی وجہ سے وہ گھر آکر بھی بھنا رہا تھا۔

''فہد! تم اپنی تعلیم پر کیوں توجہ نہیں دیتے؟ تمہیں معلوم ہے کہ ابا جان کو تم سے کتنی امیدیں ہیں۔''
رات کو باجی فہد کو دودھ کا گلاس تھمانے آئیں تو نہایت شفقت سے اسے سمجھانے لگیں مگر فہد تڑاخ سے بول اٹھا۔

''ہوں! کوئی ضرورت نہیں مجھ سے امیدیں رکھنے کی۔ اگر ابا جان کو مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو میری خواہشات کا گلا نہ گھونٹیں۔ کیا ملے گا پڑھنے سے......؟ اور مجھے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ابا جان کی طرح بڑے ہو کر دکان چلا لوں گا۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔ سارا دن ابا تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور مجھے کھپائیں ان کتابوں میں۔ وہ تو پتہ نہیں کیا کیا بولتا مگر باجی ہی اٹھ کر آ گئیں۔ ان کا دل نہایت آزردہ ہو رہا تھا۔

☆......☆

''آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں میری۔'' ابا جان آج صبح سے ہی نڈھال تھے۔ شام تک انہیں تیز بخار چڑھ گیا۔ فوری طور پر امی اور باجی رکشتہ میں ابا جی کو ہسپتال لے کر گئے۔ ڈاکٹر نے دوائیاں دیں اور سختی سے ایک ہفتے کا مکمل آرام کہہ دیا۔ کیوں

کہ ان کی طبیعت خرابی کی وجہ کام کی زیادتی تھی۔
دو دن تو دکان بند رہی مگر تیسرے دن ابا جان نے فہد کو سکول سے چھٹی کروائی اور دکان پر بھیج دیا کیونکہ گھر میں خرچ کے پیسے ختم ہو رہے تھے۔ فہد کے وارے نیارے ہی ہو گئے۔ اسکول سے چھٹی تو اس کا دیرینہ خواب تھا جو کہ آج پورا ہو گیا تھا۔
دکان کا تالا کھول کر وہ دکان سیٹ کرنے لگا اور پھر بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرنے لگا مگر یہ کیا صبح سے دوپہر ہو گئی مگر کوئی گاہک نہ آیا۔ پہلے پہل تو وہ اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا کہ سب شام کو خریداری کرتے ہیں مگر تھک کر اس نے ساتھ والی دکان کے مالک سے پوچھ ہی لیا۔ چچا حضور! کیا سارے گاہک شام کو ہی آتے ہیں؟؟ چچا حضور ہنس پڑے۔ بیٹا جس کا جب بس چلے......اور ذرا دکان دار کی بھی بات ہوتی ہے کہ وہ کس طرح گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ خیر دوپہر کے وقت فہد کو بھوک ستائی مگر اس وقت تو کوئی پیسے ہی نہ تھے۔ وہ کافی اکتا گیا تھا۔ آخر کار دو تین خواتین کپڑا لینے آ ہی گئیں۔
بچے ذرا لان کا یہ پرنٹ تو نکالنا۔ ایک خاتون نے کہا۔ پھر دوسری نے دوسرا، تیسری نے تیسرے پرنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ فہد بڑا خوش ہوا کہ چلو اب یہ تمام کپڑے خریدیں گی مگر وہ خواتین تو سوٹ پر سوٹ نکلوا رہی تھیں آخر کار فہد نے ہی پوچھا۔ باجی لینا کون سا ہے؟ اب پیسوں پر بحث شروع۔ فہد بیچارہ پریشان، ناتجربہ کار، بہرحال پانچ چھ سوٹوں میں سے صرف ایک سوٹ جب وہ لے کر گئیں تو فہد کو بہت غصہ آیا۔ اب سارے کپڑے اسے دوبارہ تھان میں لگا کر رکھنے تھے۔
شام تک کافی لوگ آ چکے تھے مگر وہ پہلے تھان پر تھان نکلواتے پھر ایک آدھ ہی لیتے اور پیسوں پر اتنا کھپاتے کہ فہد کو بے اختیار ابا حضور یاد آ جاتے۔ رات کو وہ دو ہزار روپے لے کر گھر پہنچا۔ تھکا ماندہ، بھوکا پیاسا۔ مگر گھر جا کر پتہ چلا کہ اُسے تو گھاٹا ہوا تھا اور پھر وہ دو ہزار تو ابو کی دوائیوں پر اور بل پر ہی لگ گئے۔ اگلے دن پھر اُسے جانا تھا۔ وہ شغل اگلے دن بھی جاری رہا۔ وہی تو تو، میں میں، وہی کپڑا یہاں سے وہاں۔ پھر دوپہر کو بھی بے ذائقہ سے چاول، بازار کا شور...... وہ تھک کر چور ہو چلا تھا۔ تیسرے دن وہ دکان پر بیٹھا تھا۔ آج تو ایک گاہک سے اس کی لڑائی بھی ہو گئی تھی کیونکہ اس نے تھان پر تھان نکلوانے پر اسے کھری کھری سنا دیں تھیں۔ جس پر اس گاہک نے بھی خوب سنائیں اور بولا۔ ''ارے چھوکرے، تیرے ابا کا احترام ہے ورنہ تو تجھے ایک لگاتا، ذرا صبر نہیں۔'' فہد کا دل کھٹا ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ دکانداری سے بیزار ہو چکا تھا اور دل ہی دل میں ابا کی محنت اور صبر کا قائل بھی ہو چکا تھا۔
یہی سوچتے سوچتے کہ آئندہ وہ ضرور پڑھے گا۔

''وہ اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ پلیز میرے ابا کو صحت یاب کردے۔'' اس کے گالوں پر آنسو لڑھک آئے۔ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ابا جان اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔ پیلی رنگت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے...... مگر اپنے بیٹے کا احساس تھا۔ اسی لیے جیسے ہی اٹھنے کے قابل ہوئے وہ دکان پر چلے آئے۔

''کیا سوچ رہے ہو برخوردار؟'' ابا جان ہولے سے مسکرائے۔ فہد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''میرے عظیم ابا مجھے معاف کردیں میں تو بہت نادان تھا۔'' ابا جان نے اسے گلے لگالیا اور پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔ ''صبح کا بھولا اگر شام کو واپس لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

☆......☆

جنگل میں منگل

سمیرا امیر

ایک دفعہ ہم جا رہے تھے، جا رہے تھے، جا رہے تھے، اچانک ہم راستہ ہی بھول گئے۔ ارے یہ کیا ہم تو جنگل میں پہنچ گئے۔ ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ اُف ہمارے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ جلد ہی ہم نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور ویسے بھی ہمیں جنگل دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ جواب پورا ہونے جا رہا ہے۔ ہم نے خوف کو ایک طرف رکھ کر ڈپٹ کر کہا اب ہمارے پیچھے آنے کی کوششیں بھی مت کرنا اور خود جنگل میں گھومنے نکل پڑے۔ واؤ جنگل کتنا خوب صورت ہوتا ہے؟ جنگل پر اک بھرپور نظر دوڑا کر ہم نے خود سے پوچھا۔ اچانک ہماری نظر آم کے درخت پر پڑی۔ لنگڑے لنگڑے پیلے آم درخت سے لٹکے ہمارا لقمہ اجل بننے کو تیار تھے۔ پھر ہمارے دل میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ اسے اپنے بیگ میں بھر لیا جائے تاکہ گھر پہنچ کر آرام سے کھایا اور کھلایا جائے۔ ابھی ہم نے تین آم بیگ میں ڈالے ہی تھی کہ سامنے لال لال سیبوں کے درخت پر نظر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے تو ہم حیران ہو گئے کہ آموں کے موسم میں سیب کیا کر رہے ہیں اور ابھی تو ہم نے جنگل پر نظر ڈالی تو سیب کا درخت بھی موجود نہ تھا۔

اوہو دراصل ہم اپنا چشمہ جو گھر بھول گئے تھے۔ شاید تبھی؟ خیر سے یہ گھر جا کر سوچیں گے ابھی تو ہم نے صرف بیگ بھرنا تھا۔ جلدی جلدی سیب بھی بیگ میں ڈالنے لگے۔ پھر سوچا تھوڑا اور آگے چلتے ہیں۔ ہم پانچ قدم چلے ہی تھے کہ جامن کا درخت ہمارے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا (یا شاید زیادہ بھوک لگنے کی وجہ سے ہمیں لگ رہا

ہو) ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے جامن بیگ میں ڈالے اب تو بیگ اتنا بھر چکا تھا کہ زپ بند ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر ہمیں دو جامن ہٹانے پڑے تب کہیں جا کر زپ بند ہوئی۔اب ہم نے آگے چلنے کا ارادہ کیا۔ ہمارے بالکل سامنے شیر اپنے نوکیلے دانت لیے حاضر تھا۔اس وقت ہمیں شدت سے ''ش کاظمی'' کی کمی محسوس ہوئی لیکن ہم نے بھی فیصلہ کیا ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ ہمارا ایک تھپڑ لگنا تھا کہ شیر قلابازیاں کھاتے ہوئے وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ہم نے فخر سے اپنا کالر اونچا کیا اور آگے چل دیئے۔

ایک درخت کے پاس سے گزرنے لگے کہ ایک خونخوار زہریلا سانپ کنڈلی مارے ہمیں گھور رہا تھا۔ ہماری تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔اچانک ہمیں اپنی روح پرواز ہوتے نظر آئی۔ سانپ کہنے لگا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہم آپ سے دوستی کے خواہش مند ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہم نے اپنی پرواز ہوتی روح کو پکڑ کر پھر سے خود میں فٹ کیا۔اس طرح ہم نے سانپ انکل سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جبکہ اس نے اپنی دُم۔ اس طرح وہ ہمارے کندھے پر سوار ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔

ہمیں اس سے خوف تو خوب محسوس ہوا مگر پھر سوچا خوف کو تو ہم وہیں چھوڑ آئے ہیں کیا پتہ اسے اکیلے ڈر لگ رہا ہو تبھی تو ہمارے پیچھے دوبارہ آ گیا۔

اوہ...... یہ کیا سانپ نے ہماری دوستی کو دغا دیتے ہوئے ہماری انگلی پر اپنے زہریلے ڈنگ گاڑ دیئے۔ درد کی ایک لہر ہمارے وجود میں سرایت کر گئی۔ ہمیں اپنی انگلی پر شدید تکلیف کا احساس ہوا۔

لیکن یہ کیا تکلیف اتنی تھی کہ ہماری آنکھ کھل گئی لیکن تکلیف تو اب بھی ہو رہی تھی۔ ہم نے مڑ کر اپنی انگلی کی طرف دیکھا تو وہ ہماری ذاتی بکری کا بچہ بڑے خشو و خضوع سے چوسنے میں مصروف تھا۔ ہم نے فوراً سے پیشتر انگلی چھڑائی اور آس پاس نظریں دوڑانے لگے۔(جیسے نظریں نہ ہوئی گھوڑے ہوگئے) کہ وہ پھلوں کا بیگ کہیں ہمارے سرہانے تو نہیں پڑا۔لیکن تف ہو ہماری لالچی طبیعت پر اگر خواب میں ہی تھوڑا کھا لیتے تو ذائقہ ہی منہ کو لگ جاتا۔ ہم نے پھر سے اپنی آنکھیں بند کرلیں کہ کیا پتہ خواب وہیں سے شروع ہو جائے تو ہم وہ سارا بیگ ہی چٹ کر لیں۔

☆......☆

جوتا کہانی

نگینہ امیر

جوتا ایک ایسی چیز ہے جو ہر صاحب

حیثیت اور صاحب عقل انسان پہنتا ہے۔ جوتوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، انسان جب کسی سے ملتا ہے تو چہرے کے بعد جوتوں پر نظر پڑتی ہے، مارکیٹ میں ہر ہرناپ کے جوتے دستیاب ہوتے ہیں۔ آپ صرف دکان دار سے ہی یہ سوال کریں کہ ''ذرا جوتا دکھایئے گا'' تو بہتر ہوگا بصورت دیگر آپ کو وہ جوتے دیکھنے پڑیں گے کہ عقل ٹھکانے آجائے گی اور آپ کبھی بھی جوتوں کی فرمائش نہیں کریں گے۔ بعض لوگوں کے جوتے ضرورت سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ جس پر پہلی نظر پڑنے پر کشتی کا سا گمان ہوتا ہے۔ اگر آپ کبھی جوتوں کی مرمت کروانے جائیں تو ایسی حرکت مت کریں کہ جوتے آپ کی مرمت کر لیں۔ مسجد جانے والے حضرات کے لیے جوتے باعث فکر ہوتے ہیں کہ ''جوتا چوروں'' سے کیسے محفوظ کیے جائیں اس کے لیے وہ طرح طرح کے ٹوٹکے (طریقے) استعمال کرتے ہیں لیکن چور صفت انسان کافی شاطر ہوتا ہے۔ عیدگاہ میں آئے ہوئے حضرات کلف لگے اکڑے ہوئے کپڑوں میں اکڑ کر چلتے ہیں لیکن پرانے جوتوں پر نظر پڑتے ہی ان کی اکڑ اڑن چھو ہو جاتی ہے۔ خواتین زیادہ تر سینڈلز کا استعمال کرتی ہیں لیکن وہی سینڈلز بیچ راستے میں ان کو دغا دے جاتی ہیں اور وہ شرمندہ شرمندہ دل ہی دل میں جوتوں کو کوس رہی ہوتی ہیں۔

ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ جب ہم ساحل سمندر گئے تھے، سینڈل پانی میں لے کر ہمیں کیکڑوں سے خوف آرہا تھا۔ واپسی میں ہمارے پیر چپکیلی مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں کچھ خاص پرواہ نہیں تھی لیکن تب تو ہمارے اوسان ہی خطا ہو گئے جب معلوم ہوا ابھی الہٰ دین پارک بھی جانا ہے ہمیں تو اپنے پیروں کو دیکھ دیکھ کر رونا آرہا تھا کہ یہ پیر لے کر پارک جائیں گے۔ کولر میں پانی بھی ختم تھا خوب جھٹک جھٹک کر پیر صاف کیے پر وہی شکل۔ ہم اسی غم میں غلطاں تھے کہ کوسٹر سے اترتے ہی ہمارا جوتا ساتھ چھوڑ گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہی تھی کیا کریں پھر سیفٹی پن سے ہم نے اپنے طور پر جوڑ لگایا جو ایک قدم لیتے ہی پھر ٹوٹ گئی ہمیں تو اپنی پکنک فوت ہوتی محسوس ہوئی۔ ہم پریشان کھڑے صورت حال پر غور کررہے تھے کہ کزن پر نظر پڑی جو دوسرے کزن محمد کی جوتی پہنے کھڑی تھی کیونکہ اس کی جوتی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ چونکہ وہ ہمارے جیسے حالات سے گزر چکی تھی سو ہم ان سے مشورہ کرنے پہنچ گئے، بھلا ہو محمد کا جس نے اپنی دوسری چپل کی جوڑی جو حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ لایا تھا، ہمیں عنایت کر دی اندھے کو دو آنکھیں چاہئے ہوتی ہیں اور ہمیں وہ چپل چاہیئے تھی جو تھی تو اس چھوٹے کزن سے دوگنی بڑی اور ہمارے پیروں سے تگنی بڑی چائنہ کی ہری دوپٹوں والی چپل چپکیلی اور کالی مٹی سے

لتھڑے پیروں میں اف اتنا عجیب منظر تھا کہ دل نے بے اختیار چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ چپل اس میں سما جائے جو ہمارا آخری آسرا تھی اور ہمیں محدود مدت تک کے لیے ملی تھی جب تک ہم اندر جا کے جوتے خرید نہ لیتے چھوٹے محمد کو بغیر چپل کے رہنا پڑتا۔

ہم اور ہماری کزن سب کی ہنسی برداشت کرتے ہوئے چوروں کی طرح جوتوں کی دکان جا رہے، ہم نے پیر دیکھ کر چیخ نکلنے سے خود کو باز رکھا کہ گھر سے تو ہم یہ پیر لے کر نہیں آئے تھے پھر یہ کیسے ہو گئے۔ وہیں راستے میں ہمیں ایک پانی کا ایک کولر نظر آیا ہم نے جلدی سے کہا انکل پانی پی لیں؟ انکل کی اجازت ملتے ہی ہم نے اپنے پاؤں دھونے شروع کر دیئے۔ بات تو بری تھی لیکن پیر بھی کوئی اچھے نہیں تھے، انکل نے ہمیں مسکرا کر دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا۔

بیٹا چپل لے لو نا جبکہ دکان بھی ان کی چپل کی ہی تھی۔ ہمیں تو اس وقت ہر مسکراتا بندہ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ بمشکل تمام اپنی مطلوبہ چپل ہم دونوں کزن نے لی اور وہیں پہن کر خود کو تسلی دی کہ اب ہم اپنی سابقہ حالت میں آ گئیں ہیں۔ اب کسی کو ہنسی کی نہیں حسد کی فکر ہو گی امانتدار کو اس کی چپل واپس کر کے ہم برانڈ نیو چپل میں خود کو ''جل پری'' سے تشبیہ دے رہے تھے۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ جوتوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں آپ اس قسم کا جوتا ہرگز مت لیجئے گا جو آپ کو شرمندگی سے دوچار کر کے اپنی حیثیت جتائے اور آپ کی حیثیت کو پانی پانی کر دے جیسا کہ ہماری چپل نے کیا۔

☆......☆

غوروفکر کے مواقع

زنیرہ راشد

سردیوں کی رات تھی میں اپنے کمبل میں لیٹا اپنے آپ پر رشک کر رہا تھا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل تھا کہ خاندان کا سب سے بڑا بچہ تھا اور بہت ہی پڑھاکو اور سنجیدہ۔ خاندان کے تمام بچوں کی اسکول کی چھٹیاں تھیں اور سب کے سب میرے گھر پر موجود تھے۔ سب بچے مجھے بھائی جان کہتے تھے۔ ابھی میرا رشک غرور میں تبدیل ہی ہونے والا تھا کہ اچانک فضا میں ہلچل ہوئی اور سرد ہوا کا جھٹکا ملا۔

''میرا کمبل''، ہم پوری طرح چلا بھی نہ پائے تھے کہ نصر، حسان اور صارم ہمارا کمبل لے کر فرار ہو چکے تھے۔ کمبل واپسی کے بہت تقاضے کیے مستقبل میں پٹائی کی دھمکی دی مگر کوئی بچہ واپس نہ آیا۔ بالآخر تحقیق کے لیے اٹھنا ہی پڑا۔

''ہمارا جھنڈا اس پہاڑی پر نصب ہے۔ یہ چوٹی ہماری ہے۔ جوانوں دشمنوں کو آگے ہرگز مت

بڑھنے دینا۔'' احمد پہاڑی پر جھنڈے سے چمٹا اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر رہا تھا۔ نصر، صارم اور معاذ، حسان، بلال، مصعب اور حمزہ کو پہاڑی دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گولے برسائے جا رہے تھے۔ حسان اور بلال احمد کو جھنڈے سمیت پہاڑی سے نیچے اتارنے بلکہ کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن احمد جواں مردی سے جھنڈے کو تھامے ہوئے تھا۔ اسی دھینگا مستی میں پہاڑی لرز گئی اور احمد، حسان، بلال اور نصر نیچے آ گرے۔ فضا میں کچھ چیخیں بلند ہوئیں، پھر قہقہے اور پھر یہ آٹھوں جانباز سپاہی پہاڑی کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کمبل ضبط کرنے کا مقصد !! سارے گھر کے کمبل اور لحاف جمع کر کے ایک پہاڑی بنائی ہوئی تھی۔ گھر کے سارے تکیے اسلحہ کے طور پر استعمال کیے جا رہے تھے۔ دو فوجوں میں سے کسی ایک کو قبضہ کرنا تھا پہاڑی پر۔ تکیہ پہاڑی پر رکھ کر فوج کا جانباز سپاہی اس سے چمٹ کر لیٹ جاتا اور دوسری فوج اپنا قبضہ جمانے کے لیے کوشش کرتی۔ کھیل کافی مزے کا تھا۔ ہم کافی دیر تک اپنے منے بھائیوں کو دیکھتے رہے کہ کس جانبازی سے محاذ جنگ میں مصروف ہیں اور یہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ جانباز سپاہی اپنے ملک کی حفاظت کریں اور غیر مسلموں کے خلاف لڑیں تو کفار کی کیا مجال جو ہمارے ملک پر نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ کافی دیر بعد جب گھر کے بڑوں کو سونے کا خیال آیا تو ہمیں ہمارا کمبل واپس کر دیا گیا۔ کمبل میں لیٹ کر سوچنے لگا کہ سیاچن گلیشئر پر بھی تو ہمارے جانباز سپاہی لڑ رہے تھے۔ یہ ہمارے ملک کے حکمران اگر پیچھے ہٹنے کا حکم نہ دیتے تو ہمارے محبِ وطن پاکستانی کبھی بھی سیاچن پر ہندوؤں کا قبضہ نہ ہونے دیتے۔ مجھے یہ مان ہے کہ ایک سچا مسلمان اور پاکستانی کبھی بھی باطل کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ سوچتے سوچتے کب سوئے پتہ نہیں چلا۔

ہفتے کے دن کافی مصروف گزرا پھر رات آ گئی۔ سوچ رہا تھا کہ آج خوب سوؤں گا اور اپنا کمبل ہرگز نہیں دوں گا۔

''بھائی جان آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ ننھی منی افراء ہمارے اوپر چھلانگ لگا کر خوشخبری سنا رہی تھی۔

بھائی جان ہونے کے ناتے ہمیں پھر کمبل سے سر باہر نکالنا پڑا۔ گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا صرف باورچی خانے کی لائٹ جل رہی تھی جہاں امی کام کر رہی تھیں اور ایک اور کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کا دروازہ بند تھا۔ غالباً اسی کمرے میں ہمارا سرپرائز موجود تھا۔

''بھائی جان آپ کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' افراء نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا، اندھیرے سے کیا ڈرنا۔'' ہم نے فخر

سے جواب دیا۔
''آپ کو اندھیرے میں اس کمرے کے دروازے کے سامنے جو دیوار ہے وہاں تک جانا ہے وہاں بستر پر آپ کے لیے سرپرائز موجود ہے۔'' افراء نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔
''آپ آئیں گے ناں لینے؟''
''جی بالکل آؤں گا۔'' ہم نے یقین دہانی کرائی۔ افراء صاحبہ ہم سے مذاکرات کر کے کمرے کے اندر غائب۔ تھوڑی دیر بعد اندر کی لائٹ بند ہو گئی اور آواز آئی۔ بھائی جان آجائیں اور اندر آ کر دروازہ دوبارہ بند کر دیجیے گا۔ نصر کی آواز سنائی دی۔ ہماری چھٹی حس چیخ چیخ کر پکارنے لگی کہ اندر کوئی گڑبڑ ہے مگر کیا کرتے ہم نے مذاکرات میں رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اندر گئے اور دروازہ بند کر دیا۔
آ آ آ...... ہم چلا اٹھے۔ کمرہ کے اندر داخل ہو کر ابھی حالات کا جائزہ بھی نہ لے پائے تھے کہ کوئی چیز ہمارے سر پر آ لگی۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کس نے مارا ہے میں واپس جارہا ہوں۔'' ہم کچھ مزید ڈانٹتے کہ دو تکیہ ہماری طرف فائر کیے گئے۔ اندھیرے میں ہم بچ بھی نہ پائے۔
''بھائی جان بے ایمانی نہ کریں۔ آپ کو کمرے کے کونے میں بستر تک جانا ہے۔'' معاذ کی آواز سنائی دی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ اس کمرے میں ہمارے سارے کزنز موجود ہیں اور اپنی پوزیشنز سنبھالے ہم پر نشانے لے رہے ہیں۔ ہم نے تجسس کے مارے آگے بڑھنا شروع کیا۔ مختلف چیزیں ہمیں آ آ کے لگتیں۔ شکر ہے اندھیرے میں نشانہ بازوں کو ہماری جگہ تبدیلی کا اندازہ بالکل ٹھیک نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی نشانے ان کے بہت پکے تھے ورنہ تو ہم وہیں ڈھے جاتے بالآخر ہم بستر پر پہنچ ہی گئے۔ لائٹ کھلنے کے بعد ہم نے سب سے پہلے وہ چیز دریافت کرنا چاہی جو داخل ہوتے ہی بہت زور سے لگی۔ تو پتا چلا کہ وہ افراء کے کچن سیٹ کی پلاسٹک کی شملہ مرچ تھی۔ کمرہ میں عجیب طوفان آیا ہوا تھا۔ اچانک ہی امی کمرے میں داخل ہوئیں۔
''یہ کیا حلیہ بنا کے رکھا ہوا ہے اور تم کب سے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ وہ بھی کھلونوں، گڑیوں اور تکیوں کے ساتھ۔ سمیٹو ساری چیزیں۔'' ہائے رے قسمت پہلے مار کھائی اور پھر ڈانٹ بچوں کے ساتھ چیزیں سمیٹتے ہوئے سخت غصے میں تھے۔ سوچ رہے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل اپنے ہی لوگوں کے ساتھ برا کرتی ہے آخر یہ قوم کیسے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہوگی!!

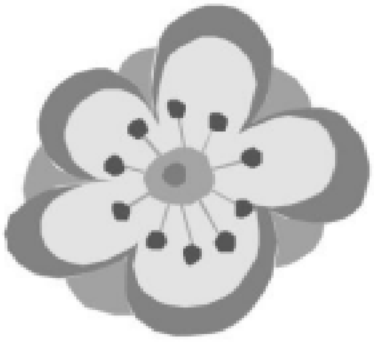

ڈھونڈو تو جانیں